عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ

طلوعِ اسلام

جولائی ۱۹۳۹

ایک روپیہ

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

مرتّبہ
محمد یونس

جلد ۲ | کراچی - جولائی ۱۹۴۹ء | نمبر ۷

فہرست

لمعات	۱ — ۸
اسبابِ زوالِ امت محترم محمد احمد صاحب عثمانی	۹-۲۵
میثاقِ خداوندی	۲۶-۳۲
سلیم کے نام ..... (کمیونزم) محترم پرویز صاحب	۳۳-۴۵
باب المراسلات (۱) سنت کا صحیح مفہوم (۲) عجمی تصورِ اسلام (۳) کیا حضور کا سایہ نہ تھا؟ (۴) اقبالؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ (۵) شب برات	۴۶-۵۸
رفعتِ محترم احمد عثمانی	۵۹
ایک نورانی صبح محترم پرویز صاحب	۶۵
ترکی اور مجلس یورپ محترم احمد عثمانی	۷۲
معراجِ انسانیت	۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دین نام تھا ایک اجتماعی نظامِ حیات کا جس میں شامل ہونے والے ہر فرد کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس اہم مقصد کے حصول کے لئے وقف تھا جو اس نظامِ حیات کا منتہائے نگاہ تھا۔ یہ نصب العین تھا دنیا میں احکامِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج۔ یعنی تمام غیر خداوندی نظام ہائے زندگی کی جگہ خالص نظامِ خداوندی کا تسلط۔ (لیظہرہٗ علی الدین کلہ)۔ ظاہر ہے کہ جس قدر یہ مقصد بلند اور اہم تھا اسی قدر اس کے حصول کے لئے تگ و تاز اور سعی و عمل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نظامِ زندگی کو اپنا نصب العین بنانے والے ہر فرد کی زندگی ایک مسلسل جہاد تھی۔ اور چونکہ وہ مقصد بہت مقدس تھا اس لئے اس کے حصول کے لئے وقف ہو جانے والی زندگی کا ہر سانس مقدس تھا۔ نماز اور روزہ اور دیگر ارکان و اعمالِ دین، اسی نظام کے اجزا اور اسی حصولِ مقصد کے ذرائع تھے۔ لہٰذا ایک مردِ مومن کی ساری زندگی عبادت، یعنی عبودیت (محکومیتِ) خداوندی کی زندہ شہادت تھی۔ وہ مصروفِ نماز تھا تو، اور مسجد کے باہر تھا تو ہر وقت نمازی تھا کہ ساری زمین اس کیلئے مسجد تھی۔ وہ رمضان کے مہینے میں روزہ دار تھا تو، اور باقی دنوں بغیر روزے کے تھا تو، وہ صائم الدھر (ہر وقت کا روزہ دار) تھا کہ جن حدود سے بچنے کا اسے حکم دیا گیا تھا وہ ان کے قریب بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ طوافِ کعبہ میں مصروف تھا تو، اور حریمِ کعبہ سے باہر تھا تو ہمیشہ کا "حاجی" تھا کہ وہ مرکزِ حکومتِ خداوندی کی حفاظت کے لئے ہمیشہ سر بکف اور شمشیر بدست تھا۔ یہ تھی ایک مسلمان کی زندگی جو ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین کی زندہ تفسیر تھی۔ اس کی صلوٰۃ اور مناسک، اس کی حیات اور ممات، سب اللہ کے لئے وقف تھی کہ اس نے اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھوں بیچ رکھا تھا تاکہ وہ اس جہنم زار دنیا کو جنت میں تبدیل کر سکے۔ یہ تھا وہ دور جس میں دین کا نظام آنکھوں کے سامنے اور اس کا مقصود دل کے نزدیک تھا۔ اس نظام کا حصولاً، دنیا سے ملوکیت اور پیشوائیت (Priesthood) کا استیصال تھا تاکہ وہ انسانوں کو جسمانی اور ذہنی ہر قسم کی غلامی سے نجات دلائے اور ہر بندے کو براہِ راست خدا کے متعین فرمودہ نظامِ حیات کے تابع لے آئے جس کی سوتیں خود اس کے ضمیر کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں۔ اس نے ملوکیت کی لعنت کو خلافت کی برکت سے بدلا اور پیشوائیت کے جذام کی جگہ قرآنی معیار کو

زندہ و پائندہ حقیقت کے طور پر نصب کر دیا کہ ہر شخص براہِ راست اپنے اعمالِ زندگی کو اس پر ناپے اور خود دیکھ لے کہ وہ کہاں تک اس پر پورے اترتے ہیں۔

یہ دور ختم ہوا تو شیطان، جو اس وقت تک پہاڑوں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا، دبے پاؤں پھر باہر نکلا۔ اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑا کر جائزہ لیا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ دین کے وہ مظاہر جو محسوس پیکروں کی صورت میں اس قوم کے سامنے تھے، ان کا انہدام مشکل ہے کیونکہ اس سے اس قوم کے جذبات کے مشتعل ہو جانے کا ڈر تھا۔ چنانچہ اس نے تلبیسِ حق و باطل میں تخریبِ حق کا بہترین سامان پوشیدہ دیکھا۔ اس نے ان مظاہر کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا لیکن ان کا مقصود و مفہوم یکسر بدل دیا۔ خلافت کو اس نے ملوکیت سے بدل دیا لیکن سلطان کی جگہ نام خلیفہ ہی رہنے دیا۔ یہی وہ نام تھا جو باقاعدہ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں دہرایا جاتا تھا۔ ادھر اس نے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مشہود پیکروں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رکھا لیکن ان سے مقصود ایک انسان کی انفرادی نجات قرار پا گیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ زندہ حقیقتیں، جو کبھی یکسر شعلہ بداماں اور انقلاب بآغوش تھیں، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئیں۔ خاکستر کے ان تودوں پر تقدس و تبرک کے بڑے بڑے قبے تعمیر کئے گئے جن کی مجاوری، پیشوائیت کے سپرد ہوئی۔ دین کا نظام، ملوکیت کے لئے پیامِ موت تھا اس لئے اس نے پوری کوشش کی کہ اس نظام کی حقیقت ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اس فریب میں رکھا جائے کہ اصل دین، یہی بے جان نمازیں اور بے روح روزے ہیں۔ یہ پیشوائیت کے تعاون کے بغیر ناممکن تھا اس لئے ملوکیت نے پیشوائیت سے مفاہمت کی اور جس طرح آریوں میں برہمن اور کھشتری کی ملی بھگت سے باقی انسانوں کو شودر بنایا گیا تھا اسی طرح ملوکیت اور پیشوائیت کی مفاہمت سے مسلمانوں جیسی جسور و غیور قوم کو ابدی غلام بنا دیا گیا۔ یہ ہے اس جگر سوز داستان کی تمہید جس سے دین، مذہب میں بدل گیا اور ارکانِ دین، رسومات بن کر رہ گئے۔ ہزار برس سے اس متاع سوختہ قوم کو اسی فریب میں مبتلا رکھا جا رہا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب پرست "(دین کی حامل نہیں بلکہ مذہب پرست") قوم کی طرح، یہ ملت بھی روز بروز ذلیل سے ذلیل تر ہوتی چلی گئی۔ جب دین کا نظام سامنے تھا تو، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ایک مسلمان کی زندگی کا ایک ایک سانس مقدس و متبرک تھا۔ جب دین، مذہبی رسومات سے بدل گیا تو اب مختلف دنوں اور مہینوں کو مقدس بنایا گیا۔ جمعہ کا مبارک روز، یہودیوں کے سبت اور عیسائیوں کے اتوار کے مطابق، مقدس دن تصور کر لیا گیا۔ شبِ برات کی رات کو ہزار یمن و سعادت کی رات قرار دے لیا گیا۔ رمضان کا مہینہ سال بھر کے گناہوں کی معافی کا مہینہ سمجھ لیا گیا۔ اس ایک رات میں ایک ایک نفل کا ثواب، ہزار ہزار مہینے کی عبادت کے برابر قرار دے لیا گیا اور اس مہینے میں شیطان کو جیل خانوں میں بند کر دیا گیا تا کہ وہ باقی

گیارہ مہینوں میں پوری آزادی سے مصروف ابلیسیت و شیطنت رہے۔ غرضیکہ وہی دین جس نے کبھی قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ کر ان کی جگہ ایک خدا کی حکومت قائم کردی تھی جس میں انسانیت اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں بڑھ رہی تھی، اب "حصولِ ثواب" کا ذریعہ بن کر رہ گیا جس کا کوئی مفہوم نہ کہنے والے کے ذہن میں ہوتا ہے نہ سننے والے کے دل میں۔ یہ تھا وہ مذاق جو اس قوم نے خدائے حی و قیوم کے اس زندہ دین سے کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ یستھزئ بھم و یمدھم فی طغیانھم یعمھون۔ اللہ نے ان کی ایسی ہنسی اڑائی کہ انھیں ان کی بے راہ روی کی طغیانیوں میں بری طرح حیران و سرگرداں چھوڑ دیا۔ کہ ہزار برس سے ٹکریں مار رہے ہیں لیکن کوئی کشادگی راہ ان کے سامنے نہیں کھلتی۔

ہمارے دورِ غلامی (یعنی انگریز کے کھلے ہوئے عہدِ حکومت) میں یہ مذاق، تنہا پیشوائیت کے ہاتھوں ہوا کرتا تھا۔ اب "خدا کے فضل و کرم" سے آزادی (یعنی فرنگیت کی نقاب پوش حکومت) کا زمانہ آیا ہے تو یہی مذاق، حکومت اور پیشوائیت کی باہمی موافقت و مفاہمت سے ہوتا ہے، جس طرح ہمارے پہلے عہدِ ملوکیت میں ہوتا تھا۔ یوں تو یہ تلاعب بالدین (دین کے ساتھ مزاح) سال بھر جاری و ساری رہتا ہے، لیکن اس کا نمایاں مظاہرہ ماہ رمضان المبارک میں آ کر ہوتا ہے۔ شعبان کے آخری عشرہ میں، پیشوائیت کے مساجدِ رشد و ہدایت اور حکومت کے ایوانِ قانون و ضوابط سے آنے والے مہینے کے تقدس و احترام کی اسکیمیں فضا میں ارتعاش پیدا کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک طرف سے "رویت ہلال کمیٹی" کی طرف سے یہ ایمان افروز" اعلان شائع ہوتا ہے کہ

> ماہ رمضان کے احترام و تقدس کے پیش نظر، جو مسلم و غیر مسلم دونوں پر واجب ہے، یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ
>
> (۱) تمام ہوٹلوں میں ایسا انتظام کیا جائے کہ لوگ کھلے بندوں کھا پی نہ سکیں، ہوٹلوں کے باہر چقیں یا پردے ڈال دیئے جائیں۔
>
> (۲) ہوٹل والے، کھلی جگہوں میں کھانے پینے کا انتظام نہ کریں۔ بہتر ہو کہ وہ پکائیں بھی ایسی جگہ جو پس پردہ ہو۔
>
> (۳) برف کی قیمت پر کنٹرول مقرر کیا جائے اور اس کی تقسیم کا صحیح انتظام کیا جائے۔
>
> (۴) شہر میں مختلف مقامات پر افطار کے لئے پانی کی سبیلیں لگائی جائیں۔
>
> (۵) تراویح کے دوران میں مساجد کے قریب و جوار لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے۔
>
> (۶) سحر و افطار کے اوقات کا اعلان بذریعہ توپ کیا جائے۔

(ڈان مورخہ ۲۳ ۱۰/۶۹)

دوسری طرف، ایوانِ حکومت سے یہ منشور جاری ہوتا ہے۔

رمضان المقدس کا احترام پبلک پر کچھ فرائض عائد کرتا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ عوام، ان لوگوں کی خاطر جو روزے رکھتے ہیں ان فرائض کی سرانجام دہی بطیب خاطر کریں گے۔ اس مہینے میں عام ہوٹلوں اور شراب کی دکانوں پر کھلے بندوں شراب کا استعمال بہ نگاہِ تنفر دیکھا جاتا ہے اس لئے ان لوگوں کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی خاطر، ایکسائز کمشنر کراچی (یعنی مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت کے محکمہ شراب کے "محتسب") نے حسب ذیل حکم نامہ صادر فرمایا ہے۔

رمضان کے مہینے میں، دیسی یا انگریزی شراب، کسی ہوٹل یا شراب کی دکان میں نہ پلائی جائے۔ شراب کی دکانیں تمام ماہ بند رہیں۔ جن ہوٹلوں کے پاس لائسنس ہے وہ وہاں کے رہنے والوں کو شراب دے سکتے ہیں۔ باہر والوں کو نہیں ...... امید ہے کہ شہر میں بسنے والے مختلف عناصر میں خوشگوار تعلقات کے قیام کی خاطر، پبلک، حکومت سے اس باب میں تعاون کرے گی۔ اور اگر اس میں اسے کچھ ذرا تکلیف بھی ہوگی تو اسے بطیبِ خاطر گوارا کرے گی۔

(ڈان مورخہ ۲۲ ۶/۴۹)

غور فرمایا آپ نے کہ رمضان المقدس کا احترام کس طرح ملحوظ رکھا جا رہا ہے! کیوں نہ ہو؟ اسلامی حکومت جو اسلامی حکومت ہے! یہ اس شراب کے متعلق حکم نامہ ہے جس کی نسبت اس خدا نے، جس کی حکومت قائم کرنے کے لئے ہم نے حال ہی میں قراردادِ مقاصد پاس کی ہے، بہ نصِ صریح ارشاد فرما رکھا ہے کہ یہ "شیطان کا عمل ہے"۔ لیکن یہ بھی سچے ہیں۔ چونکہ مولوی کہتا ہے کہ شیطان اس ماہ میں جہنم میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے حکومت بھی صرف اسی ماہ میں اس عملِ شیطان کو کمروں میں بند کر سکتی ہے۔ اس کے بعد نہ شیطان پر کوئی پابندی عائد ہو سکتی ہے نہ اعمالِ شیطان پر۔

اس کے بعد، ہمارے وزیراعظم، محترم لیاقت علی خاں صاحب کی باری آتی ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

میں نے سال گذشتہ، بتقریب رمضان المبارک، ایک اپیل شائع کی تھی جس میں یہ آرزو کی گئی تھی کہ تمام مسلمانان پاکستان اس تقدس و احترام کو ملحوظ خاطر رکھیں گے جو ماہِ رمضان سے وابستہ ہے۔ اس اپیل پر جس کشادہ دلی سے مسلمانوں نے لبیک کہا مجھے اس سے انتہائی اطمینان ہوا۔ مجھے امید ہے کہ اس سال بھی، اس ماہ میں احکامِ اسلام کی پوری پوری پابندی کی جائے گی (ڈان مورخہ ۲۷ ۶/۴۹)

کیا کوئی صاحب محترم وزیراعظم سے پوچھ کر اتنا بتا سکتے ہیں کہ (الف) اس مہینے میں احکامِ الٰہی کی پابندی پر کیوں خصوصیت سے زور دیا جاتا ہے اور سال کے باقی دنوں اس پابندی کی ضرورت کیوں نہیں سمجھی جاتی؟ اور (ب) مسلمانانِ پاکستان نے کس شکل میں محترم وزیراعظم کی اپیل پر سال گذشتہ لبیک کہا تھا؟

اب اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ حکومت کی طرف سے باقاعدہ نمازِ تراویح کی ادائیگی، لوٹوں اور مصلوں کی فراہمی اور ٹریم کے وقت میں توسیع، وغیرہ کے لئے تمام ائمہ مساجد کی طرف سے حکومت کے شکریہ کے لئے ریزولیوشن پاس ہوں گے اور اربابِ حکومت کے درازیٔ عمر و اقبال کی دعائیں مانگی جائیں گی۔ اس طرح سے اس حکومتِ خداوندی کا عملی قیام ہوگا جس کے لئے چند ماہ قبل ہماری مجلسِ آئین ساز نے قراردادِ مقاصد منظور کر کے اپنے جہادِ عظیم کا ثبوت دیا تھا۔

ہماری اس تلخ نوائی سے بہت سی جبینیں شکن آلود ہو جائیں گی اور بہت سی آنکھیں خون آمیز لیکن ہماری یہ چیخیں خدا کے اس عذاب کے تصور سے بے ساختہ نکل رہی ہیں جو اس کے دین سے مذاق کرنے کی پاداش میں قوموں کو گھیر لیا کرتا ہے۔ اور جس کے ضمن میں انھیں اس طرح (Warn) کیا جاتا ہے کہ فلیضحکوا قلیلا و لیبکوا کثیرا۔ ان کے مقدر میں بہت تھوڑی ہنسی اور بہت لمبا رونا ہے۔ جزاءً بما کانوا یکسبون۔ یہ ان کے اعمال کی سزا ہے۔ سخر اللہ منھم۔ اللہ کی طرف سے ان کی ہنسی کی پاداش۔ دینِ خداوندی سے مزاح کا فطری نتیجہ۔ اور اس کی وجہ؟ الذین اتخذوا دینھم لھوا ولعبا وغرتھم الحیوٰۃ الدنیا۔ وہ لوگ جنھوں نے دین کو مذاق بنا لیا۔ (اور یہ اس لئے کہ) دنیاوی زندگی (میں جذب و انہماک) نے انھیں فریب میں رکھا ہے۔

یہ بہت بڑا فریب ہے۔ لیکن فریب کسی دوسرے سے نہیں، خود اپنی ذات سے فریب ہے۔ یخدعون اللہ والذین اٰمنوا۔ وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔ یہ دھوکا دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور مومنین کو۔ لیکن یہ (انھیں نہیں) صرف اپنی ذات کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے (کہ یہ کس طرح اپنے آپ کو ہلاکت کے جہنم کی طرف دھکیل رہے ہیں۔)

دنیا میں کوئی قوم ابدی قوانین سے ہنسی اور اقدارِ مستقلہ سے مذاق سے زندہ نہیں رہ سکی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا اور خدا کے قانون میں کسی کے لئے بھی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔

مغربی پنجاب کی بزمِ سیاست میں خان ممدوٹ کی وزارت اور ممتاز دولتانہ کی صدارت کے زمانے میں دلچسپ ہنگامہ آرائی اور گرمجوشانہ ٹاٹر خالی رہتی تھی۔ لیکن اول الذکر کی برطرفی اور آخر الذکر کے استعفے نے اس محفل کو بالکل سونا کر دیا تھا۔ چنانچہ جب مولوی عبدالباری کی صدارت کی باری آئی تو جملہ سیاسی ہنگامے خاموش ہو چکے تھے۔ وزارت اور مقننہ کے ان ہنگاموں کے سرچشمے تھے معطل ہو چکے تھے۔ ممتاز دولتانہ نے میدان خالی دیکھ کر کرسی صدارت بھی خالی کر دی اور سیاست کی رہی سہی غوغا آرائی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس ہُو کے عالم میں باری مسند آرائے صدارت ہوئے۔ ان کے عہد کا یہ ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے کہ انھوں نے تن تنہا محفل کو

اس حد تک گرا دیا کہ مدوٹ اور دولتانہ بھی انگشت بدنداں رہ جائیں۔

مغربی پنجاب میں دفعہ ۹۲ ک کے نفاذ نے جب مسلم لیگ کے سامنے انتخاباتِ عامہ کا سوال پیش کیا تو اس نے محسوس کیا کہ اب وہ غیر منقسم ہندوستان کی "واحد با اختیار نمائندہ" مسلم لیگ نہیں رہی بلکہ اب اس کی آبرو باختگی کا یہ حال ہے کہ انتخابات میں کامیابی مخدوش ہے۔ اس کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے کیا کیا جا سکتا تھا؟ مخلصانہ خدمتِ ملت کا حل یقینی تھا لیکن وہ منزل کٹھن اور دور و دراز تھی۔ انتخابات میں کامیابی کے لئے فوری کارروائی کی ضرورت تھی۔ مسلم لیگ نے فوراً گورنر موڈی سے درخواست کی کہ مسلم لیگ کو حکومت اور عوام کے مابین بطور رابطہ تسلیم کیا جائے۔ ایک اور وفد پاکستان کے وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی خدمت میں بھی درخواست لیکر حاضر ہوا۔ خواجہ صاحب نے انکشاف فرمایا کہ اس مضمون کے احکام صوبائی حکومت کے نام جاری کر دیئے گئے ہیں۔ خواجہ صاحب نے یہ یقین بھی دلایا کہ وہ بنفسِ نفیس پنجاب تشریف لیجایا کرینگے اور بچشمِ خود ملاحظہ کیا کریں گے کہ ان احکامات پر عمل ہو رہا ہے۔

یہ احکام اور یہ سرکاری سند بجائے خود درست، لیکن مسلم لیگ عملاً کیا کر سکتی تھی؟ اس کے پاس ملک و ملت کے گوناگوں مصائب کا کوئی حل اور ترفیع اور ترقی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ تقسیم ہند نے ملی سیاست میں جو خلا پیدا کر دیا تھا مسلم لیگ اس خلا کا مشہود پیکر تھی۔ اس کا منشا و مقصد بقا و استیلائے ذات سے علاوہ کچھ نہ تھا، لیکن اس بقا اور استیلا کی اساسات مفقود تھیں۔ وہ عوام کے سامنے کیسے سرخرو ہو سکتی تھی۔ اس تیر کو خطا جاتے دیکھ کر مسلم لیگ نے بستر اٹھایا۔ اسے اپنی بدنامی اور آبرو باختگی کے لئے ایک سہل الحصول قربانی کے بکرے کی تلاش ہوئی۔ "گورنر راج" اور اس کی "غیر آئینیت" اور "جمہوریت کا حیاتِ آفریں گوہرِ جان"— نعرے میسر آ گئے، جن سے سیاسی فضا مرتعش ہوتی نظر آئی اور پھر سے امیدیں بندھنا شروع ہو گئیں کہ اب مسلم لیگ کی بحالی یقینی ہے۔ مسلم لیگی حلقوں سے گورنر راج کی مذمت ہونے لگی جو بتدریج شورانگیز ہوتی گئی۔ گورنر مغربی پنجاب نے ایک موقع پر اس غیر آئینیت کی اس طرح وضاحت کی کہ یہ گورنر راج سابقہ گورنر راجوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے، کیونکہ آزادی سے پیشتر جب کسی صوبے کا آئین معطل ہوتا تھا اور نظم و نسق گورنر کے سپرد ہو جاتا تھا تو گورنر کسی ملکی ادارہ کے سامنے جوابدہ نہیں رہتا تھا بلکہ وہ ملک معظم کی حکومت کا نمائندہ ہو جاتا تھا اور برطانوی پارلیمان کے سامنے جوابدہ۔ آئینی اور جمہوری نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال ناقابلِ برداشت تھی۔ لیکن اب مغربی پنجاب کا گورنر پاکستان کے پاکستانی گورنر جنرل کے سامنے جوابدہ ہے۔ بالفاظِ دیگر مغربی پنجاب پر کوئی غیر ملکی آمر مسلط نہیں بلکہ پاکستانی ناظم اعلیٰ کا نمائندہ کاروبارِ حکومت چلا رہا ہے۔ اس وضاحت (اظہارِ حقیقت) کے بعد مغربی پنجاب کے نظم و نسق کی سرانجام دہی کی ذمہ داری آخر کار گورنر جنرل پر عائد ہوتی تھی، اور گورنر کی مینہ بے راہرویاں اور

بداعتدالیوں کے لئے گورنر جنرل کو ذمہ دار متصور کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ان کی حیثیت غالب کے الفاظ میں "قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو" کی تھی۔

مسلم لیگ نے اس آئینی پہلو کو آسانی سے نظر انداز کر دیا اور غیر پاکستانی گورنر کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ ایک موقع پر صوبائی مسلم لیگ کے سکریٹری مسٹر ولایت علی خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ گورنر راج کی غیر آئینیت کو کم کرنے کے لئے مسلم لیگی مشیر مقرر کئے جائیں۔ یہ مطالبہ بداہتہً طفلانہ تھا، کیونکہ مغربی پنجاب کو یہ روزِ بد مسلم لیگ ہی کے ہاتھوں دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ آخر یہ سب کچھ مسلم لیگی وزارت اور صدارت کی مردود استیلائی جنگ ہی کا تو نتیجہ تھا۔ یہ مطالبہ مسلم لیگ کی "طبیعت" میں پہلو بدلتا رہا بالآخر ایک قرارداد کی صورت میں "موزوں" ہوا جو ۲۲ مئی کو صوبائی مجلس عاملہ نے منظور کی اور جس کا ملخص حسب ذیل ہے:

> مجلس عاملہ نے دفعہ ۹۲ (الف) کا نفاذ عارضی مصلحت کے طور پر قبول کیا تھا اور آغاز ہی میں اس کی غیر آئینیت اور غیر ذمہ داری کو کم کرنے کے لئے تعاون کی پیش کش کر دی تھی۔ چار مہینوں کے تجربے نے ہمیں یہ باور کرا دیا ہے کہ قومی جماعت کے تعاون کو ٹھکرا دیا گیا ہے اور گورنر کی آمریت حد سے بڑھ گئی ہے اور روز بروز ہمارے ملی حسیات کے منافی ہوتی جا رہی ہے . . . . موجودہ گورنر کی حکومت تقاضائے وقت پیدا کرنے سے قاصر ہے . . . . مجلس کی حتمی رائے ہے کہ برطانوی گورنر کا طرزِ حکومت عوام اور حکومت میں عناد کے باطل پردے حائل کرتا جا رہا ہے . . . . گورنر نے مسلم لیگ کو درہم برہم کرنے کے لئے نہایت سنگین کوششیں کی ہیں . . . . اور وہ مسلم لیگ کو ختم کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے . . . . لہٰذا مجلس موجودہ غیر پاکستانی گورنر کی فوری واپسی اور اس کے بجائے پاکستانی گورنر کے تقرر کا مطالبہ کرتی ہے . . . . (اس برطرفی کے بعد ہی) حکومت اور مسلم لیگ میں خاطر خواہ تعاون کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

اس قرارداد سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

(۱) مغربی پنجاب کی مسلم لیگ نے شروع میں گورنر راج کی غیر آئینیت کو کم کرنے کے لئے تعاون کی پیش کش کی لیکن حکومت نے اسے قبول نہیں کیا۔

(۲) گورنر کا رویہ اس حد تک منافیٔ مفادِ عوام اور منافیٔ مسلم لیگ ثابت ہوا کہ جب تک اس گورنر یعنی سر فرانسس موڈی کو برطرف کر کے پاکستانی گورنر کا تقرر نہیں ہوتا مسلم لیگ مغربی پنجاب کی حکومت سے تعاون نہیں کر سکتی۔

اس قرارداد کے شائع ہوتے ہی وزیر اعظم پاکستان، لیاقت علی خاں، نے ۲۴ مئی کو اپنی طرف سے اس کا جواب اخباری بیان کی صورت میں دیا جس میں آپ نے گورنر کے متعلق فرمایا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو

صدق دلی اور وفاداری سے سرانجام دے رہا ہے۔ صوبائی مسلم لیگ کی قرارداد پر اظہار افسوس کرتے ہوئے آپ نے یہ انکشاف فرمایا،

> (مغربی پنجاب میں) آئین معطل کر دینے کے دوسرے ہی دن مسلم لیگ کا ایک وفد (لاہور میں) مجھ کو ملا۔ . . . میں نے اس وفد سے کہا کہ وہ مجھے نصف درجن نام دیں جن میں سے غیر سرکاری مشیر مقرر کئے جا سکیں۔ فروری میں ایک وفد مجھ سے کراچی میں ملا۔ میں نے اس دعوت کو دہرایا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ مغربی پنجاب مسلم لیگ نے آج تک ایسا نہیں کیا۔ . . .

اس کے بعد آپ نے پھر مسلم لیگ کو دعوت دی کہ وہ موزوں حضرات کے نام پیش کرے تاکہ ان میں سے مشیر مقرر کرنے کے مسئلہ پر حکومت غور کر سکے۔

مغربی پنجاب مسلم لیگ کی قرارداد (۲۰ مئی) جن دو اساسات پر قائم تھی وزیر اعظم پاکستان نے دونوں کو باطل قرار دیدیا۔ مسلم لیگ کا کہنا ہے کہ اس نے تعاون کرنا چاہا لیکن اس کے دست تعاون کو ٹھکرا دیا گیا۔ محض یہی نہیں بلکہ گورنر نے الٹا مسلم لیگ کو ختم کر دینے کا عزم کر لیا۔ اس کے برعکس وزیر اعظم پاکستان فرما رہے ہیں کہ گورنر اپنے فرائض وفاداری سے سرانجام دے رہا ہے۔ نیز مسلم لیگ کو متعدد دعوتیں دی گئیں کہ وہ اپنے مشیر دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اگر وزیر اعظم پاکستان کا یہ فرمانا بجا ہے تو مسلم لیگ کی ساری قرارداد سفید جھوٹ ہو جاتی ہے۔ آخر حقیقت کیا ہے؟ وزیر اعظم پاکستان کے اس بیان کے جواب میں مغربی پنجاب کی مجلس عاملہ نے ۲۸ مئی کو ایک قرارداد منظور کی، اس میں تسلیم کیا گیا کہ

> وزیر اعظم پاکستان نے یقیناً ایک ملاقات میں مشیروں کے تقرر کی پیشکش کی!

اگر یہ صحیح تھا تو مسلم لیگ نے پہلی قرارداد میں اس کا ذکر کیوں مناسب نہ سمجھا؟ وہ کونسی مصلحت تھی جس کے ماتحت اس راز کو عوام سے مخفی رکھنا ضروری سمجھا گیا؟ اور اگر صداقت یہ بھی ہے اور اس سے کچھ زیادہ بھی جیسا کہ مسلم لیگ کی دوسری قرارداد سے ظاہر ہوتا ہے تو وزیر اعظم پاکستان نے کیوں اس کا تذکرہ ضروری نہ سمجھا؟ کیا ملک و ملت کو وہی کچھ بتایا جانا چاہیئے جو صاحب بیان کے مقصد و خواہش کے مطابق ہو؟ ۲۸ مئی کی جوابی قرارداد میں حقیقت کا مندرجہ ذیل ٹکڑہ بھی سامنے آیا،

> اس دعوت کو قبول کر لینا حماقت تھا، کیونکہ اس طرح چند افراد موجودہ غیر جمہوری نظام حکومت کے پرزے بن جاتے اور حکومت کے استبداد کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگی مشیروں پر عائد ہو جاتی . . . مسلم لیگ نے اس فوری ضرورت پر زور دیا کہ موجودہ گورنر کی بجائے پاکستانی گورنر کا تقرر کیا جائے جو مسلم لیگ اور عوام کا بہی خواہ ہو۔ یہ مطالبہ شائع نہیں کیا گیا تھا۔

معاملہ کے اس پہلو پر کچھ روشنی ضمنی طور پر مغربی پنجاب مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس میں بھی ڈالی گئی جو ۹ جون کو

(بقیہ صفحہ [illegible] پر ملاحظہ فرمائیے)

اسبابِ زوالِ امت

(از محترم عمر احمد صاحب عثمانی، شیخ الحدیث، دارالعلوم، چاٹگام)

موقر ماہنامہ "طلوعِ اسلام" ماہ مارچ [illegible] میں ایک اہم سوال شائع کیا گیا ہے اور ہر صاحب فکر کو دعوت دی گئی ہے کہ اپنے نتیجۂ تدبر سے طلوعِ اسلام کو اطلاع دے۔ میں کوئی صاحب فکر نہیں اس لئے غالباً میں اس خطاب کا مخاطب بھی نہیں تھا مگر اڈیٹر صاحب طلوعِ اسلام کے ایک ذاتی خط نے مجھے بھی اپنے کو اس کا مخاطب تصور کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ لہٰذا تعمیلِ ارشاد میں چند سطور حضرتِ قارئین ہیں۔

یہ سوال جتنا اہم ہے اس کا حل کرنا اس سے کہیں زیادہ کٹھن اور الم انگیز ہے۔ ادارہ کی خواہش ہے کہ جواب مختصر ہو مگر میں نہیں سمجھ سکا کہ اختصار کے ساتھ اس کا جواب دینا ممکن کیسے ہے۔ یہ ایک داستان ہے اور بہت بڑی داستان۔ دو چار سال کی نہیں بلکہ پورے چودہ سو سال کی۔ اسے مختصر بھی کیا جائے تو آخر کہاں تک۔ کہیں مختصر کرتے کرتے بالکل چیستاں ہی نہ بن جائے۔ تاہم میں کوشش کروں گا کہ ممکن اختصار سے کام لیتے ہوئے اصل بات پیش کر سکوں۔

حوض اور تالاب ہر جگہ ہوتے ہیں اور یہاں بنگال میں تو گھر گھر ہیں۔ مشہور ہے کہ جس کے گھر میں تالاب نہ ہو اس کے بیٹے کو بہو نہیں مل سکتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کے بیٹے کو ہم اپنی لڑکی کیسے دے سکتے ہیں، اس کے ہاں تالاب تو ہے ہی نہیں۔ تالاب کا پانی جس نے دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا پانی کچھ ہی عرصے کے بعد خراب ہو جاتا ہے اور پینے کے کام کا نہیں رہتا۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ پانی محبوس ہوتا ہے اس پر روانی کی راہیں ہر طرف سے بند کر دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ندی، نہر اور دریا کے پانی ہزارہا سال تک بھی خراب نہیں ہوتے، کیونکہ وہ رواں دواں ہوتے ہیں۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے کہ جہاں کسی چیز پر سکون طاری ہوا اس پر موت نے اپنا قبضہ جما لیا۔ تالاب کا پانی ساکن ہوتا ہے اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر یہ موت بالکل غیر محسوس طور پر طاری ہوتی ہے اور اس کا عمل اتنا تدریجی اور غیر محسوس ہوتا ہے کہ عام لوگ درمیانی اسٹیجوں میں اس کا احساس بھی نہیں کر سکتے کہ پانی پر موت طاری ہونا شروع ہو گئی ہے۔ جب موت اپنا قبضہ پوری طرح پر

جا لیتی ہے تو ایک عالم اور جاہل ایک شہری اور ایک دیہاتی بالکل یکساں طور پر بیک وقت فیصلہ کر دیتے ہیں کہ پانی خراب ہو گیا ہے۔

بالکل یہی حال اسلام کا ہوا ہے۔ یہ ایک جوئے رواں تھا۔ اس میں حرکت تھی اور جب تک اس میں حرکت اور زندگی رہی یہ برابر منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتا چلا گیا۔ نہ صرف قدم بڑھاتا چلا گیا بلکہ یہ جوئے رواں آہستہ آہستہ ایک عظیم الشان دریائے مواج بنتی چلی گئی۔ ایسی دریائے مواج کہ راہ کی بڑی بڑی چٹانوں حتیٰ کہ بڑے بڑے پہاڑوں تک کو بہالیتی چلی گئی۔ مگر اس کی یہ روانی و دوانی نصف صدی کم سے بھی کم قائم رہی۔ اگر چودہ سو سال تک قائم رہ جاتی تو شاید اس زمین سے آگے دوسری زمینیں بھی آج اس کی زد میں آچکی ہوتیں۔ اس کی روانی کی رفتار کا اس سے اندازہ فرمایئے کہ چالیس سال کے بعد ہی اس کی روانی قطعاً بند ہو چکی تھی اور وہ دریائے مواج سمٹنا شروع ہو گیا تھا مگر سمٹتے سمٹتے اس کو تالاب بننے میں تیرہ سو سال صرف ہو گئے اور ان درمیانی مراحل میں کسی کو احساس تک نہ ہو سکا کہ یہ جوئے رواں تالاب بنتی چلی جا رہی ہے، تاآنکہ وہ وقت آپہنچا کہ تالاب کا پانی سڑنا شروع ہو گیا اور بقول "طلوعِ اسلام" اب یہ حالت ہو گئی کہ

یہ سوالات ایسے ہیں کہ تاریخ و سیاست کے ہر طالب علم کے سامنے آتے ہیں۔

اور میں کہتا ہوں کہ گھبرایئے نہیں وہ وقت بھی آرہا ہے کہ طالب علموں سے گذر کر یہ سوالات ہر عامی کے سامنے آنے لگیں گے۔

بہرحال دو لفظوں میں اس سوال کا مختصر جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ ذلت و نکبت کا ذمہ داران کا جمود و تعطل ہے۔ اور علاج پھر یہی ہے کہ اس میں از سرِ نو پھر روانی پیدا کر دی جائے

میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے اشارات آپ حضرات کی سمجھ میں نہیں آئے اس لئے میں مجبور ہوں کہ تھوڑی سی تفصیل آپ حضرات کے سامنے پیش کر دوں تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ اسلام کی جوئے رواں میں روانی کیسی تھی اور سکون کب اور کیسے پیدا ہوا۔ اس کے لئے پہلے چند باتیں سمجھ لیجئے اور پھر تاریخ اسلام کا ذرا سرسری نظر سے مطالعہ کر جایئے۔ مگر اس مطالعہ میں شخصیت پرستی سے ہٹ کر واقعات و حقائق کو ذرا غیر جانبدارانہ طریقہ پر دیکھئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے لئے یہ گراں ضرور ہو گا مگر یاد رکھئے کہ حقائق ہمیشہ تلخ ہی ہوا کرتے ہیں اور جو لوگ حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں انھیں یہ کڑوے گھونٹ پینے ہی پڑتے ہیں۔

دیکھئے! قرآن کریم ایک مجموعۂ اصول ہے، جزئیات کی کتاب نہیں ہے۔ اسے مجموعۂ جزئیات ہونا بھی نہ چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ تو انسانیت کے ارتقاء کا ایک جامع اور مکمل نصاب ہے اور انسانیت

ترقی ہی اس وقت کرسکتی ہے جبکہ انسانی شعور وادراک کیلئے روانی اور حرکت کی راہیں کشادہ کرکے چھوڑ دی جائیں۔ ورنہ نتیجہ سکون ہمیشہ موت ہی ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا تھا۔ قرآن چاہتا یہ ہے کہ وہ خطوط کو متعین کردے اور ان خطوط پر انسانیت خود اپنی مساعی اور روزافزوں تجربات سے کام لے کر اپنے ماحول کی خود تشکیل کرتی چلی جائے۔

پھر چونکہ انسانیت اپنی ارتقائی منازل بتدریج طے کرتی چلی آرہی ہے اس کے لئے بیک جنبشِ قلم ارتقاء کے آخری نقطہ پر پہنچ جانا قطعاً ناممکن ہے۔ اس لئے میں اور ترقی کرکے کہتا ہوں کہ قرآن کے لئے جزئیات کو بیان کرنا ممکن بھی نہیں تھا، کیونکہ اگر وہ جزئیات کو بیان کرتا تو سوال یہ ہے کہ ارتقاء کی کونسی منزل کی جزئیات کو بیان کرتا۔ ابتدائی، وسطی یا آخری؟ پھر ہر منزل کی ہزارہا سیڑھیاں ہیں اور ہر سیڑھی بجائے خود ایک منزل ہے۔ تو قرآن آخر بیان کرتا تو کس منزل اور کس سیڑھی کی جزئیات کو بیان کرتا۔ ظاہر ہے کہ قرآن چونکہ آخری نصاب ہے جس کے بعد کوئی اور نصاب (کتاب الٰہی) آنیوالا نہیں اسلئے لامحالہ وہ آخری منزل کی جزئیات ہی بیان کرسکتا تھا۔ حالانکہ انسانیت ابھی تک اس منزل تک پہنچی بھی نہ تھی۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان جزئیات کو اس عہد میں جو قرآن کا مخاطبِ اولیٰ تھا سمجھتا کون؟ نتیجہ یہی ہوتا کہ قرآن قرنِ اول کے مسلمانوں کے لئے ایک چیستان ہوتا۔

مثال کے طور پر سمجھئے کہ انتخاب امام کا مسئلہ قرآن کو بیان کرنا تھا چنانچہ اس نے اصولی طور پر بیان کردیا کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ

مگر اس کی جزئی تفصیلات سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے اس مسئلہ کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ آیا۔ "امیر کا انتخاب افرادِ قوم کے مشورہ سے ہو" دنیا کے لئے غالباً یہ سب سے پہلا تجربہ تھا ورنہ آج تک باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا ہی امیر ہوتا آیا تھا۔ اس میں نہ افرادِ قوم کے مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ کسی باقاعدہ انتخاب کی۔ چنانچہ اس اصلِ قرآنی کے مطابق سب سے پہلا انتخاب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب تھا۔ لیکن اگر صدیق اکبرؓ کے انتخاب کی تفصیلات آپ کو معلوم ہیں تو ذرا اس کا موازنہ آج کل کے ان انتخابات سے کیجئے جو متمدن ممالک میں پریذیڈنٹ کو منتخب کرنے کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا انتخاب بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ متمدن ممالک کے موجودہ انتخابات اُسی صدیق اکبرؓ کے انتخاب کی ارتقائی شکلیں ہیں جو یورپ نے خود اسلام سے سیکھی ہیں۔ صدیق اکبرؓ کا انتخاب اسی اصلِ قرآن کی ایک ابتدائی شکل تھی اور یہ موجودہ انتخابات اس کی شاید درمیانی صورتیں ہیں کیونکہ کون کہہ سکتا ہے کہ انسانیت اپنے آخری نقطہ تک پہنچ چکی ہے اور اس کے بعد اس میں کوئی ترقی نہ ہوگی۔

لہٰذا جہاں یہ دعویٰ صحیح ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا انتخاب قطعاً صحیح اور مکمل انتخاب تھا اور اب سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کی دنیا میں انسانیت جس منزل پر تھی اس منزل پر وہ قرآنی اصل "وامرھم شوریٰ بینھم" کی بالکل صحیح تفسیر تھی ایسے ہی یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ آج کی دنیا میں انسانیت جس منزل پر ہے اور اس منزل پر اس طریقہ انتخاب نے جو ارتقائی شکل اختیار کر لی ہے وہ بھی قرآنی اصل کی بالکل صحیح تفسیر ہے اور آئندہ جو جو صورتیں بنتی چلی جائیں گی وہ سب بھی اسی اصل کی صحیح تفسیریں ہوں گی۔ پھر سوال یہ ہے کہ آج کل کے ان انتخابات میں پروپیگنڈا کے مختلف مراکز قائم کرنا، تمام مرکزوں کا باہمی ٹیلیفونی ارتباط، پوسٹروں، اخباروں، لاؤڈ اسپیکروں اور ریڈیو کے ذریعہ سے قوم کے سامنے اپنے پروگرام پیش کرنا، تقریروں کے ریکارڈ کرنا اور ہر ریڈیو اسٹیشن سے ان کو براڈکاسٹ کرانا انتخابات کے اجزا ضروریہ ہیں، تو غور فرمائیے کہ کیا اب سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کی دنیا موجودہ انتخابات کی جزئیات کو سمجھ سکتی تھی، جبکہ اب سے سو ڈیڑھ سو سال پہلے کی دنیا کے لئے بھی ان کا سمجھنا مشکل تھا؟ اگر قرآن کریم ان تمام جزئیات کو بیان کرتا تو ان کا حشر وہی کچھ ہوتا جو ہمارے مفسرین کے ہاتھوں قرآن کی بہت سی آیتوں کا ہوا ہے۔ کہ ریڈیو، براڈکاسٹنگ، ٹیلیفون، لاؤڈ اسپیکر، پروپیگنڈا، ریکارڈ وغیرہ میں سے کچھ تو فرشتوں کے نام قرار پا جاتے، کچھ جہنم کی وادیوں کے نام رکھ دیئے جاتے اور کچھ کو جنت کے باغات کے نام قرار دیا جاتا۔ اور یہ صرف انتخاب امیر ہی میں نہیں بلکہ بالکل یہی حال تجارتی جزئیات میں بنکنگ اور ایکسچینج اور تمام ایسے مسائل کا ہوتا جن کا اس زمانہ میں وجود نہیں تھا۔

علاوہ ازیں بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں جن کا مدار قوم کے تغیر پذیر حالات پر ہے، لہٰذا ہمیشہ کے لئے ان کی کوئی معینہ شکل مقرر نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً یہ سوال کہ مرکز ملت کو ملی ضروریات کیلئے افرادِ قوم سے کس مقدار میں ٹیکس لینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اگر ملی ضروریات کی ہمیشہ کے لئے کوئی خاص تحدید نہیں کی جا سکتی تو ٹیکس کی تحدید کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔ قرآن نے اصولی طور پر طے کر دیا کہ افراد پر ٹیکس لگایا جائے گا جس کا نام زکوٰۃ ہوگا۔ مگر یہ کہیں متعین نہیں کیا کہ اس ٹیکس کی مقدار کیا ہوگی۔ زکوٰۃ کی تاکید قرآن کریم میں تین سو سے زائد مقامات پر آئی ہے مگر مقدار ایک جگہ بھی نہیں آئی حالانکہ یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ جس مسئلہ کو قرآن ایک دو مرتبہ نہیں تین سو سے زیادہ مرتبہ بیان کر سکتا ہے اگر ایک جگہ اس کی مقدار بھی بیان کر دی جاتی تو کیا دشوار تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا منشاء اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ قرآن از خود اس کی تحدید کرنا چاہتا ہی نہیں بلکہ مقدار کی تعیین کو وہ مرکز ملت پر چھوڑتا ہے کہ وہ حالات و ضروریات کے مطابق ہر زمانہ میں اس کی مناسب تحدید و تعیین کر سکے۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی وجوہ ہیں جن کی بنا پر قرآن کریم نے قصداً جزئیات سے احتراز کیا ہے

تاکہ انسانی عقل و شعور کے لئے راہیں ہمیشہ کھلی رہیں اور قرآن ہر منزلِ زندگی میں انسانیت کی راہنمائی کر سکے۔
مگر ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تگ و تازِ زندگی میں انسانیت کو کلیات سے نہیں بلکہ جزئیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ قرنِ اول کو جب جزئیات سے واسطہ پڑا تو مرکزی حیثیت سے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ اور ماحول کے مطابق قرآنی کلیات کی تشریح و توضیح فرمائی، آپ کی یہ تمام تشریحات و توضیحات اسلامی اسٹیٹ کے قوانین تھے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جزئیات کے متعلق آپ نے جو احکام صادر فرمائے تھے وہ رسول کی حیثیت سے نہیں بلکہ امیرِ ملت کی حیثیت سے فرمائے تھے۔
آپ کی ان دونوں حیثیتوں کا فرق اتنا واضح اور صاف ہے کہ تحقیق و تدقیق کے ساتھ علم حدیث و فقہ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ درحقیقت آپ نے اس میں خلط مبحث کرنے کی کوئی گنجائش چھوڑی ہی نہیں۔ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ قرآنی کلیات کی جو کچھ آپ نے تشریح و توضیح فرمائی تھی ان کی حیثیت اس وقت اسلامی اسٹیٹ کے قوانین کی تھی۔ مگر بایں ہمہ آپ نے امت کو نہایت سختی سے منع فرما رکھا تھا کہ قرآن کریم کے سوا جو کچھ میں بیان کرتا ہوں اس کو ہرگز ہرگز قلم بند نہ کیا جائے۔ دوسری طرف قرآن کریم کو قلم بند کرانے کا اہتمام اس قدر تھا کہ کاتبینِ وحی، حفاظ اور قراء کی خاص جماعتیں مقرر تھیں۔ قرآن کی آیات اور سورتوں کو خاص اہتمام کے ساتھ حفظ کرایا جاتا تھا اور ہر مسلمان کو تاکید تھی کہ قرآنی سورتوں کی تلاوت پنج وقتہ نمازوں میں کی جائے، راتوں کو نوافل میں پڑھا جائے۔ مگر ارشاداتِ نبویؐ کے لئے قطعاً یہ اہتمام نہیں تھا، بلکہ ان کو قلمبند کرنے کی اور اُلٹی ممانعت تھی۔ صحابہ میں سے حضرت صدیق اکبرؓ اور عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے متعلق سراغ ملتا ہے کہ انھوں نے کچھ بھی ارشاداتِ نبویؐ کے مجموعے تیار کئے تھے۔ یہ دونوں حضرات بڑے جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ حضورؐ نے ان کو اجازت دیدی ہو کیونکہ ان کے متعلق آپ کو اطمینان تھا کہ یہ دونوں حضرات خلط مبحث نہیں فرمائیں گے۔ چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ ان دونوں حضرات نے نہ خود کبھی خلط مبحث کیا اور نہ آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے کسی غلط فہمی یا خلط مبحث کا کوئی سامان چھوڑ کر گئے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ کے متعلق صراحتہً معلوم ہے کہ یہ مجموعۂ احادیث زندگی بھر ان کے ساتھ رہا اور آخری زمانہ آیا تو پانی منگوا کر اس مجموعہ کو دھو کر صاف کر ڈالا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق اگرچہ صراحت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنے مجموعۂ احادیث کو کیا کیا تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان کی زندگی کے بعد ان کے اس مجموعہ کا بھی کہیں سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ غالباً صدیق اکبرؓ کی طرح انھوں نے بھی آخری عمر میں اس کو ضائع فرما دیا ہوگا۔
اکابر صحابہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دونوں حیثیتوں کا فرق بخوبی سمجھے ہوئے تھے قرآن کریم کے

علاوہ وہ کسی چیز کو مکتوب حیثیت سے دیکھنے کے یہاں تک روادار نہ تھے کہ مرض الوفات میں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے صرف تین روز پہلے جب اکابر صحابہ کے سامنے ارشاد فرماتے ہیں کہ قلم دوات منگاؤ تاکہ میں تمہیں ایک ہدایت نامہ تحریر کرا دوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو تو اکابر صحابہ نے جن میں حضرت عمرؓ پیش پیش تھے صاف فرما دیا کہ "حسبنا کتاب اللہ" آپ کو اس وقت تکلیف ہے، ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے کسی اور مکتوب کی ضرورت نہیں۔ صحابہ میں سے کچھ حضرات نے اس رائے سے اختلاف کیا۔ آپس میں تیز تیز گفتگوئیں ہوئیں۔ مگر حضرت عمرؓ کا پلہ بھاری تھا چنانچہ وہ مکتوب نہیں لکھا جا سکا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عملاً اعتراف فرما کر حضرت عمرؓ کی رائے کی معقولیت کی یوں توثیق فرما دی کہ اس کے بعد تین روز تک آپ زندہ رہے اور اس عرصہ میں مرض کی شدت میں کافی تخفیف بھی رہی مگر پھر اس تحریر لکھوانے کا آپ نے ارادہ بھی نہیں فرمایا حالانکہ حضرت عمرؓ وغیرہ کی مخالفت کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی بنا پر ایک اہم اور ضروری کام کو یوں چھوڑ دیا جاتا۔ پھر ظاہر ہے کہ یہ حضرات چوبیس گھنٹے آپ کے پاس حاضر نہیں رہتے تھے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ کا ارادہ ہوتا تو بسہولت وہ تحریر لکھوائی جا سکتی تھی۔ لہذا قطعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعد میں محسوس فرما لیا تھا کہ حضرت عمرؓ اور ان کے ہمنواؤں کی رائے زیادہ صحیح تھی۔

پھر خلافتِ راشدہ کی تاریخ کا اگر تدبر سے مطالعہ کیا جائے تو جہاں متعدد نظیریں ایسی ملتی ہیں کہ خلفائے راشدین نے ضرورت پڑنے پر کونسل سے مشورہ کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات سے اختلاف فرمایا ہے اور جب سوال کیا گیا ہے تو یہی جواب دیا ہے کہ "اب زمانہ بدل چکا ہے اگر حضور آج زندہ ہوتے تو آپ بھی ایسا ہی حکم دیتے" وہیں سینکڑوں مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ انتظامی معاملات میں انھوں نے نئے نئے طریقے ایجاد کئے اور نئے نئے قوانین نافذ کئے جن کا آپ کے زمانہ میں کوئی وجود نہیں تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی اہتمام رکھا کہ قرآن کریم کو ہر ممکن سے ممکن طریقہ پر محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ان قوانین واصلاحات کا کوئی باقاعدہ یا بے قاعدہ ریکارڈ نہیں رکھا۔ کیونکہ وہ حضرات جانتے تھے کہ ہمارے یہ قوانین واصلاحات بھی اصولی اور دوامی حیثیت کے مالک نہیں ہیں۔ غیر متبدل اور غیر منسوخ چیز اس نیلگوں آسمان کے نیچے اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف کتاب الٰہی ہے۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات کا کوئی ریکارڈ نہیں چھوڑا تو ہم اپنے نافذ کردہ قوانین کا کوئی ریکارڈ کیوں چھوڑیں۔

قرآن کریم کی قرارت کے طریقوں میں اختلافات رونما ہونے شروع ہوئے تو مرکز نے فوراً ضرورت محسوس کی کہ یہ اختلاف جو آج زیر زبر پیش کا معمولی اختلاف ہے آگے چل کر کہیں کوئی خطرناک صورت اختیار نہ کر لے۔ چنانچہ فوراً قرآن کریم کو کتابی شکل میں مدون کیا گیا اور اس کی نقلیں تمام اطراف وجوانب میں

بھی گئیں اور نہایت سخت احکامات نافذ کیے گئے کہ اگر کہیں ان نسخوں کے خلاف کوئی نسخہ نظر آئے تو اُسے فوراً نذرِ آتش کر دیا جائے۔ مگر ارشاداتِ نبویؐ کے ناقلین میں اس سے کہیں بڑھ کر اختلافات تھے۔ مگر ان اختلافات کو قطعاً اہمیت نہیں دی گئی۔ خلفائے راشدین میں سے کسی نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہ کی کہ ارشاداتِ نبوی کا بھی کوئی صحیح اور مستند مجموعہ مرتب کرا دیا جائے، کہیں آگے چل کر یہ اختلافات کوئی سنگین صورت اختیار نہ کرلیں۔ بلکہ اس کے برعکس جن کے پاس یہ مجموعے موجود بھی تھے انھوں نے بھی اپنی زندگی ہی میں ان مجموعوں کو ضائع فرما دیا کہ کہیں آئندہ چل کر یہ مجموعہ ہائے احادیث قرآن کی جگہ نہ لے لیں۔ یعنی مستقل قانونی اور اصولی حیثیت اختیار نہ کرلیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ صحابہ میں سے جو ناقلین احادیث تھے ان سے ہر حدیث کے متعلق گواہ طلب کیے جاتے تھے۔ اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکتے تو دُروں سے خبر لی جاتی تھی گویا نقلِ حدیث پر مرکزِ ملت کی جانب سے ہمت افزائی نہیں بلکہ خاصی ہمت شکنی کی جاتی تھی۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحابہ کو نقلِ حدیث کی جرأت بہت کم ہوتی تھی۔

مگر ان سختیوں کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین کی ایک مجلس شوریٰ ہوا کرتی تھی جس کے ممبر اکابرین صحابہ ہوا کرتے تھے۔ اصاغرین صحابہ میں سے بھی بعض ایسے حضرات منتخب کر لئے جاتے تھے (مثلاً ابن عباسؓ) جن کے علم و تقویٰ پر خلفاء کو اعتماد ہوا کرتا تھا۔ تمام پیش آمدہ معاملات ان مجالسِ شوریٰ میں بحث و تمحیص کے بعد طے کیے جاتے تھے۔ ان مجلسوں میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ اگر قرآن کریم میں اس معاملہ کے متعلق کوئی صریح حکم نہ ملتا تو اس کے بعد پھر سب سے پہلے یہی سوال ہوتا تھا کہ اس امر کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی کوئی فیصلہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر حضورؐ کا کوئی فیصلہ موجود ہوتا تھا تو اس کے آگے سب کی گردنیں جھک جاتی تھیں[1]۔ حضرات شیخینؓ کے بعد دوسرے سوال کے بعد تیسرا سوال یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر حضورؐ کا کوئی فیصلہ موجود نہیں ہے تو حضرات شیخینؓ میں سے کسی کا کوئی فیصلہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوا تو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا تھا[1]۔ البتہ دوسرے اور تیسرے سوال میں یہ ضرور دیکھ لیا جاتا تھا کہ زمانہ کی تبدیلی کی بنا پر اس فیصلہ میں کسی ردّ و بدل یا حک و اضافہ کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوتی تھی تو معمولی تغیر کر دیا جاتا تھا مگر یہ تغیر ہمیشہ ایسا ہوتا تھا جو اصول کے ساتھ ساتھ خود اس فیصلہ کی روح کے خلاف بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر چونکہ زمانہ میں کچھ ایسا زیادہ بعد بھی نہیں ہوا تھا اس لئے عموماً بعد میں آنے والوں کو اپنے سے پیشرو کی مخالفت کی ضرورت بہت ہی کم محسوس ہوا کرتی تھی۔

---

[1] یعنی اگر یہ دیکھا جاتا کہ زمانہ کی تبدیلی کی بنا پر اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں جیسا کہ صاحبِ مضمون نے اگلے فقرہ میں تصریح فرما دی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

اس کے بعد بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ مرکزی مجلس شوریٰ کے پاس کسی مسئلہ کے متعلق جہاں قرآن کریم کی کوئی صریح آیت نہیں ہوتی تھی وہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرات شیخین کا کوئی فیصلہ بھی موجود نہ ہوتا تھا ایسی صورت میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ قرآن کریم یا سنتِ نبویؐ و شیخینؓ میں اس کی کوئی نظیر بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر کوئی نظیر مل جاتی تھی تو اس پر قیاس کر کے اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ اور اگر کوئی نظیر بھی نہیں ملتی تھی تو مجلس شوریٰ اتفاق رائے سے جو فیصلہ کر دیتی تھی وہ ناطق اور واجب العمل قرار پا جاتا تھا۔

مگر جیسا کہ ارشاداتِ نبویؐ کا کوئی باقاعدہ یا بے قاعدہ ریکارڈ نہیں تھا ایسے ہی فیصلہ ہائے شیخینؓ اور مجلسِ شوریٰ کے قیاسات یا اجماعات کا بھی کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ اگر کسی چیز کا ریکارڈ تھا تو وہ قرآن اور صرف قرآن کا تھا۔

خلفاء راشدین کے عہد برکت عہد میں عام دستور العمل یہی تھا اور یہاں تک معاملہ اتنا صاف تھا کہ کسی اشتباہ کا کوئی اندیشہ ہی نہیں تھا۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ تہائی صدی کے بعد ہی خلافت نے ملوکیت کا جامہ پہن لیا اور خلیفۂ وقت کو جو مذہبی اور دینی قیادت کی حیثیت حاصل تھی وہ یکسر ختم ہو گئی جس کی تخم ریزی خود خلافتِ راشدہ ہی کے عہد میں ہو چکی تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری چھ سال جو اندرونی سازشوں اور باہمی کاوشوں کا دور تھا درحقیقت اس فتنہ کی ابتدا تھے۔ کچھ حضرات (مجھے کہنے دیجئے کہ کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر) خلافت کے خواہشمند تھے (جس میں یقیناً وہ بدنیت نہیں تھے) ادھر حضرت عثمانؓ طبعاً رحم دل اور نرم مزاج واقع ہوئے تھے۔ دونوں باتوں نے مل کر خلافت کے وقار کو نہایت صدمہ پہنچایا۔ خلیفۂ وقت کی دیانت و امانت پر حملے کئے جاتے تھے جن کو برداشت کیا جاتا تھا یہی وہ بنیاد تھی جس پر آئندہ کی تمام عمارت بلند ہوئی۔

خلیفۂ وقت کی شہادت کے بعد ان کی جگہ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ خلافت کا وقار تو خلیفۂ سوم کی المناک شہادت سے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کی باہمی آویزشوں نے جو کچھ رہا سہا وقار رہ گیا تھا اسے بھی دجلہ و فرات کی لہروں کے حوالہ کر ڈالا۔ طرفین کے حامیوں نے ایک دوسرے کے خلاف وہ وہ کیچڑ اچھالا کہ

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

ان فتنوں نے یہاں تک سر ابھارا کہ امت یہی بھول گئی کہ خلافت کا مقام کونسا مقام تھا اور اس کی مذہبی پوزیشن کیا تھی۔ طرفین کے بیانات سنئے۔ امیر معاویہؓ کے حامی کہتے تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ شروع سے ہی خلافت کے دعویدار اور خواہشمند تھے۔ جبھی تو صدیق اکبرؓ سے بھی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی۔ پھر حضرت عمرؓ کی خلافت

پہلے بھی ان کو اعتراض تھا مگر حضرت عمرؓ کی سخت گیری ہمیشہ دامن گیر رہی جس نے انھیں سر اٹھانے نہیں دیا۔ ہاں حضرت عثمانؓ کی طبعی نرمی نے ان کیلئے میدان ہموار کر دیا، چنانچہ خوب خوب سازشوں کا جال پھیلایا۔ کوفہ، بصرہ اور مصر کی چھاؤنیوں میں خلافت کے خلاف باقاعدہ اور منظم پروپیگنڈا کرایا گیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے وہ خطوط پکڑے گئے جن میں انھوں نے باغیوں کو دعوت دیکر مدینہ منورہ بلایا اور خلیفۂ وقت کو شہید کرا ڈالا۔ جس باغی جماعت نے خلیفۂ سوم کو شہید کیا تھا اسی جماعت کے ہاتھوں خود خلیفہ بنے اور خلیفہ بننے کے بعد خلیفۂ مظلوم کا قصاص اور انتقام لینے کے بجائے قاتلینِ عثمانؓ کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ انھیں ہر طرح سے نوازا گیا۔ چنانچہ دیکھ لو آج بھی وہی لوگ ان کے دربار میں سپید و سیاہ کے مالک ہیں۔ دوسری طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حامیوں کی طرف سے حضرت امیر معاویہؓ کو خلافت کا خواہشمند، خود غرض اور جاہ پرست قرار دیا گیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ درحقیقت وہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے واقعہ کو محض اسلئے اچھال رہے ہیں کہ اس سے اپنا سیاسی مفاد حاصل کریں۔ پھر اس سلسلے میں امیر معاویہ سے ہٹ کر ابوسفیان اور ہندہ کی اسلام دشمنی کے واقعات کو بیان کر کرکے امیر معاویہ کو ملعون ٹھرایا گیا۔

مجھے یہاں یہ فیصلہ نہیں کرنا ہے کہ فریقین میں سے کونسا فریق حق پر تھا اور کونسا باطل پر۔ اور درحقیقت ہمیں یہ زیب بھی نہیں دیتا کہ ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد ہم آج حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان محاکمے کریں مگر ان باہمی آویزشوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ طرفین کے دعوے سننے کے بعد عوام پر یہی اثر ہوتا تھا کہ گویا دنیا اور محض دنیا کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ پھر طرفین پر نکتہ چینیاں اس بلا کی ہوتی تھیں کہ بعض مرتبہ مخالفین کی طرف سے نہیں بلکہ خود حامیوں اور مددگاروں کی طرف سے خلفاء کو متنبہ کیا جاتا تھا کہ فلاں گناہ یا غلطی سے توبہ کرو، تجدید ایمان کرو ورنہ ہم تمہارا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ حتیٰ کہ خلیفہ کو خود اپنے حامیوں سے قتال کرنا پڑتا تھا۔ اب آپ اندازہ فرمایئے کہ خلافت راشدہ کے آخری عہد میں خلافت کی پوزیشن کیا ہو چکی تھی۔ خلافت کی مذہبی حیثیت گویا ختم ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے خلافت کو ملوکیت کا جامہ پہنایا ہے انھیں کچھ زیادہ دقتیں پیش نہیں آئیں۔ کیونکہ خلافت کا صحیح مقام پہلے ہی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

بہر حال جب خلافت نے ملوکیت کا چولا بدل لیا اور سلاطین (بزعم خویش خلفاء) نے بھی اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ مذہبی قیادت سے دست بردار ہو کر محض دنیوی قیادت پر اکتفا کریں کیونکہ جہاں ایک طرف عوام کی طرف سے مذہبی قیادت کا ان سے کوئی مطالبہ نہیں تھا وہیں دوسری طرف وہ اس قیادت کی اہلیت بھی اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ خلافت کو دین اور دنیا دونوں کی قیادت کا مجموعہ ہونا چاہیے انھوں نے اس کی قطعاً کوشش نہیں کی کیونکہ اس طرح انھیں خود اپنی جگہ خالی کرنا پڑتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ

انھوں نے برضا و رغبت مذہبی قیادت سے دست کشی اختیار کرلی مگر یہ دست کشی بالکل بے قاعدہ طور پر عمل میں آئی۔ سلطنت نے یہ قیادت باقاعدہ طور پر علمار کی کسی جماعت یا کونسل کے حوالہ نہیں کی تھی بلکہ اس نے کیا یہ تھا کہ خود مذہبی قیادت کی مسند خالی کردی تھی پھر جس نے اس مسند کو زینت دینا چاہی انھوں نے اس کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام اجتماعی صورت سے نہیں بلکہ انفرادی حیثیت سے شروع ہوا۔ ہر قریہ، ہر شہر اور ہر صوبہ میں جدا جدا اماموں کی مسندیں بچھ گئیں اور حسب مقدور جتنا جس سے ہو سکا مذہبی قیادت کے فرائض ادا کرتا رہا۔ جس سے مذہبی تشتت و انتشار کی بنیاد پڑی اور سینکڑوں فرقے پیدا ہو گئے۔ مگر جس قدر یہ فرقے تعداد میں زیادہ تھے اتنی ہی ان کی عمریں بھی کم تھیں۔ البتہ ان میں چار امام ایسے گذرے جنھوں نے ایک حد تک باقاعدگی سے کام کیا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے اصول و قوانین وضع کئے اور پھر ان اصول کے ماتحت استخراج و استنباطِ مسائل کا کام شروع کیا۔ ان کے سامنے مشعلِ راہ وہی دستور العمل تھا جو خود خلافت راشدہ کا دستور العمل تھا کہ سب سے پہلے قرآن کو دیکھا جائے، پھر ارشاداتِ نبویؐ کو، پھر سنتِ خلفار کو، اس کے بعد قیاس سے کام لیا جائے اور پھر کونسل کی اتفاق رائے سے۔

ارشاد نبویؐ اور آثار صحابہ کے ساتھ مرکزِ ملت کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ اگر ضرورت مقتضی ہو تو وہ ارشاداتِ نبویہ اور سابقہ خلفا کے صادر فرمودہ قوانین میں ایسا معمولی ردوبدل بھی کر سکتے تھے جو اصولِ قرآنیہ اور اصولِ حکم کی روح کے خلاف نہ ہو۔ مگر چونکہ اس امر پر غور کرنے کا حق کسی خلیفہ راشد کی کونسل (مرکزِ ملت) کو ہی تھا نہ کہ افرادِ امت کو، اس لئے ان حضراتِ ائمہ نے درحقیقت اپنے نزدیک انتہائی امانت و دیانت سے کام لیا کہ خود اس حق کو استعمال نہیں کیا بلکہ اسے جوں کا توں چھوڑ دیا۔ ایسے ہی مرکزِ ملت کا اتفاق رائے چونکہ اب مفقود ہو چکا تھا کیونکہ اب نہ خلفار، خلفار رہے تھے اور نہ ان کی کونسلیں تھیں اور حضرات علمار کرام جو کام کر رہے تھے وہ انفرادی حیثیت سے کر رہے تھے نہ کہ اجتماعی حیثیت سے اس لئے اس حق کو بھی انھوں نے استعمال نہیں کیا بلکہ فیصلہ یہ کیا کہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں ان کی مجالسِ شوریٰ کا جن مسائل پر اتفاق ہو چکا ہے[1] اس کو حجت قرار دیا جائے اور اس کے بعد کا زمانہ چونکہ علیٰ منہاج النبوۃ نہیں ہے اس لئے وہ قطعاً قابلِ استدلال نہیں۔ لہٰذا دلیل کے یہ چار ستون تجویز ہوئے، نصِ قرآنی، ارشاد نبوی و آثار صحابہ، قیاس، اجماعِ صحابہ[2]

---

[1] جب ارشاداتِ نبویؐ اور سنتِ خلفار کہیں بھی تحریری طور پر موجود نہ تھے تو پھر یہ ائمہ ان کی طرف رجوع کیسے کرتے تھے؟۔ (طلوعِ اسلام)

[2] ارشاد نبویؐ و آثار صحابہ اور اجماع صحابہ یقینی طور پر کہیں موجود نہیں تھے اس لئے یہ حصہ قیاسی تھا یعنی بجز قرآن اور اس پر متفرع اپنا قیاس ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ تمام ستون اربعہ یقینی طور پر شریعت کے ماخذ نہیں قرار پا سکتے۔ (طلوعِ اسلام)

بہرحال اس عہد میں یہ دو بنیادی تغیر عمل میں آئے۔ اوّل گذشتہ امرا بِ ملت کے احکام میں تبدیلی کرنے کا حق سلب کر لیا گیا کیونکہ اس تبدیلی کا حق صرف مرکزِ ملت ہی کو ہو سکتا تھا جو اب باقی نہیں تھا۔ دوئم خلفاء کی کونسل کے اتفاق رائے کو اب کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی کیونکہ یہ کونسلیں حقیقی معنی میں مرکزِ ملت نہیں کہلا سکتی تھیں۔ بلکہ وہ سلاطین کی خود غرضیوں کے شرمناک اکھاڑے تھے جن کے ممبر اہلِ علم وفضل نہیں بلکہ شاعر، شاطر، بھانڈ، گویّے اور مسخرے ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن کونسلوں کی ہیئتِ ترکیبی یہ ہو ان کو ایسے وسیع اختیارات دیدینا امت کو تباہی کے غار میں دھکیلنے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

رہ گیا یہ سوال کہ ان حضرات ائمہ نے اگر اتنا ہی کیا ہوتا تو واقعی مضائقہ نہیں تھا۔ انھوں نے تو اس سے کہیں بڑھ کر یہ کیا کہ ان دونوں حقوق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امت سے سلب کر لیا۔ جس سے امت کے قوائے عمل ہمیشہ کے لئے مفلوج ہو گئے۔ مگر میرے نزدیک ایسا سمجھنا انتہائی غلطی ہے۔ حضرات ائمہ نے یہ حقوق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کہیں سلب نہیں کئے انھوں نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق صرف اپنے زمانہ سے یہ حقوق سلب کئے تھے۔ اور یہ بات شاید ان کے وہم وگمان میں بھی کبھی نہ گذری ہو کہ ہماری یہ کوششیں ابدی حیثیت اختیار کر لیں گی اور چودہ سو سال تک آنے والی نسلوں کے لئے مذہب بن جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس تصریح کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہم ان حقوق کو ان حالات کی وجہ سے سلب کر رہے ہیں اگر امت کو کبھی یہ توفیق اور قدرت حاصل ہو کہ وہ مرکزِ ملت کو صحیح بنیادوں پر قائم کر سکے تو ان مراکز کو پھر یہ حقوق حاصل ہو سکیں گے۔ علاوہ ازیں اگر حالات وواقعات پر غور کیا جائے تو آسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ وہ حضرات ائمہ ملوکیت کی جس لعنت سے دوچار تھے اُن حالات میں یہ تصریحات مناسب بھی نہیں تھیں کیونکہ وہاں ملوکیت اپنی بدترین صورت میں کارفرما ہوتے ہوئے بھی مدعی اس کی تھی کہ ہماری یہ ملوکیت اپنی ہزاروں ہزار لعنتوں کے باوجود دراصل خلافت ہے اور اسے وہی حقوق حاصل ہیں جو خلفاء راشدین کے عہد میں اس کو حاصل تھے۔ تو درحقیقت ان حالات میں ان تصریحات سے فائدہ کی بجائے نقصانات کا خطرہ کہیں زیادہ تھا۔ البتہ یہ حضرات ہمیشہ ان کوششوں میں لگے رہے کہ مرکزِ ملت کو صحیح بنیادوں پر پھر سے قائم کر دیں۔ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور تمام بڑے بڑے ائمہ کی عمریں انھی جرائم کی پاداش میں جیل خانوں میں گذر گئیں۔ خود ہندوستان میں یہ کوششیں برابر ہوتی رہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی امام احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کا نام نامی اور ان کی مساعی جمیلہ سے کون واقف نہیں ہے۔

بہرحال میں دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا حالات وواقعات کے ماتحت ہوا اور سمجھ کر ہوا کہ ان حالات میں اس سے بہتر راہ عمل کوئی اور ممکن ہی نہیں تھی۔

اب چونکہ ارشاداتِ نبویہؐ اور آثارِ صحابہ دلیل کا دوسرا ستون قرار پاچکے تھے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو کتابی صورت میں مدون کیا جائے۔ چنانچہ علماء کی ایک جماعت اسی فن کی تکمیل میں لگ گئی اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس فن کو اتنے بلند مرتبہ تک پہنچا دیا جس سے زیادہ کی توقع انسانی قوائے علمیہ اور بشری کوششوں سے کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ انھوں نے ایک ایک روایت کو سند سے بیان کیا۔ پھر ہر روایت کی جتنی سندیں تھیں سب کو جمع کردیا جس سے بیک نظر معلوم ہوسکتا ہے کہ اس روایت کو بیان کرنے والے ہر دور میں کتنے لوگ تھے۔ رواۃِ سند کی جانچ پڑتال کی گئی اور ایک ایک راوی کے پوست کندہ حالات جمع کئے گئے جس سے اسماء رجال کا ایک مستقل فن پیدا ہوگیا کہ آج ہر راوی کے متعلق ہم آسانی سے معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ کس حیثیت اور کس پایہ کا راوی تھا۔ اس کا حافظہ، اس کا تقویٰ، اس کی دیانتداری۔ اس کے اخلاق و عادات کس پایہ کے تھے، عقیدہ کیا تھا اور عمل کس قسم کا تھا۔ کن کن علماء سے اس نے علم حاصل کیا اور کن کن علماء نے اس کی شاگردی اختیار کی۔ پھر یہ بھی کہ اس کے ہمعصر علماء کی اس کے بارہ میں کیا رائے تھی۔ پھر اصولِ حدیث کے نام سے روایات کی تنقید و تنقیح کا ایک مستقل فن قائم کیا گیا جس میں وہ اصول و ضوابط منضبط کئے گئے جن سے صحیح و سقیم روایات کو بآسانی ممتاز کیا جاسکے۔ یہ اصول و ضوابط اس قدر مکمل ہیں کہ آج بیسویں صدی کے نقادی تحقیق و تفتیش کی اس گرم بازاری کے باوجود اُن کی گردتک کو نہیں پاسکے۔ مگر پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ یہ تمام کوششیں انفرادی حیثیت سے کی گئیں اور جنھوں نے کیں وہ بہرحال انسان تھے جو خطا اور لغزش سے معصوم قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ اس لئے قدرۃً کچھ نہ کچھ کوتاہیاں رہ گئیں جنہیں دور کیا جاسکتا ہے، اور دور کیا جانا چاہئے۔ مگر میں کسی درجہ میں بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو کچھ کیا گیا وہ بیکار کیا گیا یا قصداً ناقص طریقہ پر کیا گیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ درحقیقت انسانی کوششوں کے ثمرات اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ وہ نقطۂ معراج تھا جہاں تک ان کے عہد میں انسانی مساعی کی تگ و تاز ممکن ہوسکتی تھی۔ ان حضرات نے جو کچھ کیا وہ انتہائی نیک نیتی اور نہایت دیانتداری کے ساتھ کیا۔ اور یہ ان کی نیک نیتی اور دیانت داری ہی تھی کہ ان کی مساعی کے ثمرات صدیاں گذر جانے کے باوجود آج تک زندہ ہیں اور مرغوب خواص و عوام ہیں۔ ہم ان ذخیروں کی شاید اس لئے ناقدری کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہمیں یہ خزانے بغیر کسی محنت و مشقت کے حاصل ہوگئے ہیں۔[1]

---

[1] ناقدری کا سوال نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ ان خزانوں کو ان کے صحیح مقام پر رکھا جائے، اس سے آگے نہ جایا جائے۔ اس تمام سعی و کاوش کے باوجود جو ہمارے اسلاف رحمہم اللہ نے اس باب میں کی یہ مجموعے بہرحال ظنی ہیں، یقینی نہیں۔ اس لئے ان کی حیثیت تاریخ کی ہے۔ (طلوع اسلام)

ان حضرات نے کبھی یہ دعویٰ نہیں فرمایا کہ ہماری کوششیں اغلاط و اسقام سے بری ہیں یا ہماری ان مساعی کا درجہ نعوذ باللہ قرآن کریم کے برابر یا اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ بعد کے آنیوالوں نے اگر ان کی کوششوں کو غلط طریقہ پر بڑھا چڑھا کر قرآن کریم کے برابر یا اس سے بھی آگے پہنچا دیا تو قصور ایسا کرنے والوں کا ہے نہ کہ حضرات فقہاء و محدثین کا۔ وہ انسان تھے۔ انھوں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ ان کی مساعی میں اگر کوئی نقص رہ گیا ہے تو یہ بعد کے لوگوں کا کام تھا کہ ان نقائص کو دور کرتے۔ انھوں نے تحقیق و تدقیق کا راستہ کھولا تھا، متاخرین کا فرض تھا کہ ان لائنوں پر مزید ترقی کرتے۔ مگر مگر ہماری دون ہمتی سے یہ تو ہوا نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ایک جماعت نے متقدمین کے کارناموں کو ترقی کی معراج تصور کر لیا جس پر اب کسی نقطہ کا اضافہ ہی ممکن نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسری جماعت پیدا ہوئی جس نے متقدمین کی مساعی پر خاک ڈالنا ہی اپنا فریضہ قرار دے لیا۔ کتب احادیث کے ذخیرے سے انھوں نے چند احادیث منتخب کر لیں جو بظاہر یا درحقیقت قرآن اور اصول مسلمہ کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اور ان کو اچھالنا شروع کر دیا کہ دیکھو بخاری شریف میں ایسی ایسی حدیثیں ہیں صحیح مسلم میں ایسی ایسی روایتیں ہیں۔ مطلب یہ کہ نہ بخاری مستند ہے نہ مسلم اور نہ کوئی اور حدیث کی کتاب۔ میرے خیال میں دونوں راہیں افراط و تفریط کی راہیں ہیں، اس لئے نہ یہ راستہ صحیح ہے اور نہ وہ پہلا راستہ۔ ضرورت ہے کہ ٹھنڈے دل سے دیانتداری کے ساتھ ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور احادیث کے پورے ذخیرہ کی پھر سے چھان بین کرے اور تحقیق سے جو روایات غلط ثابت ہوں ان کو الگ کر دیا جائے۔ یہ کام کچھ نیا کام بھی نہیں ہے۔ متقدمین میں سے بعض حضرات نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔ چنانچہ امام دارقطنی نے خود صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی بعض روایتوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔

احادیث کی تنقید و تنقیح کے اصول خود متقدمین کے بنائے ہوئے موجود ہیں۔ انہی اصولوں سے کام لیکر اس قسم کی بہت سی روایات کو الگ کیا جا سکتا ہے۔ پھر میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اصول بھی آخری ہیں کہ ان میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ لیکن کم از کم میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ وہ اصول بڑا اچھا خود بہت حد تک مکمل ہیں اور ہم چاہیں تو انہی اصول سے کام لیکر احادیث کے ایسے بڑے حصہ کو الگ کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس خواہ مخواہ کی ضد کے لئے کوئی وجہ جواز موجود نہیں ہے کہ سرے سے احادیث سے انکار ہی کر دیا جائے۔ طلوع اسلام جب اس روش کا نقیب بن کر میرے سامنے آتا ہے تو مجھے انتہائی دکھ ہوتا ہے۔ اس روش سے ایک بہت ہی افسوسناک نتیجہ جو نکل رہا ہے وہ یہ ہے کہ متاخرین میں بہت سے ایسے حضرات موجود ہیں جو واقعی کام کے آدمی ہیں۔ خدا نے انھیں علمی بصیرت سے نوازا ہے مگر ان کی صلاحیتیں تعمیر کے بجائے تخریب میں صرف ہو رہی ہیں۔ پھر جو تعمیری کام بھی وہ کرتے ہیں وہ کتنا ہی مفید اور ضروری کام کیوں نہ ہو

عوام اس سے محض اس بنا پر مستفید نہیں ہو پاتے کہ وہ حضرات پبلک میں محض انکارِ حدیث کے جرم میں مطعون ہیں۔ اس لئے ان کی آواز جسے عالمگیر ہونا چاہیے تھا صرف ایک طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جو میرے نزدیک بہت ہی بڑا نقصان ہے۔[1]

صفحاتِ بالا میں جو امور زیرِ بحث آئے ہیں یا ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ مختصراً وہ امور یہ ہیں:۔

(۱) مسلمانوں کی موجودہ ذلت و نکبت کا ذمہ دار ان کا جمود و تعطل ہے۔

(۲) یہ جمود و تعطل بالکل غیر ارادی طور پر حوادث و واقعات کے ماتحت طاری ہوتا چلا گیا اور ہوتا چلا جا رہا ہے جس سے نکلنے کا راستہ امت کو آج تک نہیں مل سکا۔

(۳) "دین" یعنی اصول اور غیر متبدل قوانین "قرآن" اور صرف قرآن ہے۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو حیثیتوں کے مالک تھے:۔

(۱) خدا کے رسول اور پیغامبر

(۲) امیرِ ملت۔

پہلی حیثیت سے جو چیز آپ نے امت کو دی وہ قرآن ہے اور دوسری حیثیت سے جو چیز عطا فرمائی وہ جزئیاتِ قوانین ہیں۔

(۵) قرآن کریم کو جو اصولی اور غیر متبدل قانون تھا ہر طرح محفوظ رکھا گیا ہے مگر قانونی جزئیات کا کوئی باقاعدہ یا بے قاعدہ ریکارڈ نہیں رکھا گیا تھا۔ لہٰذا یہ اس حیثیت کے مالک نہیں ہیں جس کا قرآن مالک ہے۔

(۶) یہ قانونی جزئیات دوامی نہیں ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر ان میں ترمیم کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ ترمیم قرآن کریم کے اصولی قوانین کی روح سے متصادم نہ ہو۔

(۷) اس ترمیم کا حق صرف "خلافتِ راشدہ" یعنی صحیح بنیادوں پر قائم شدہ مرکزِ ملت کو ہے، اشخاص و افراد کو نہیں۔

(۸) تہائی صدی کے بعد کس طرح خلافت نے ملوکیت کا جامہ پہنا اور کس طرح جمود و تعطل کی بنیاد پڑی۔

(۹) فقہاء و علماء نے جزئیاتِ قوانین کو مدون کرتے وقت ترمیم کے حق کو استعمال نہیں کیا کیونکہ وہ اس مرکزی حیثیت کے مالک نہیں تھے جو اس کیلئے ضروری تھی۔

(۱۰) ان ائمہ کے بعد سے آج تک جوں جوں ہمتیں پست ہوتی گئیں تحقیق کے دروازے بند ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ متقدمین کے تمام کارنامے جوں کے توں رہ گئے اور ان میں مزید ترقی نہیں ہو سکی۔ حتیٰ کہ مشرہ

---

[1] مضمون کے آخر میں "استدراک" دیکھئے (طلوعِ اسلام)

شدہ وہ آج اصولی حیثیت کے مالک بن گئے۔

(۱۱) چونکہ آج تک مرکزِ ملت صحیح بنیادوں پر قائم نہیں کیا جا سکا اس لئے جزئیات قوانین میں کوئی ترمیم بھی نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس جو قانون آج موجود ہے وہ وہ ہے جو آج سے تیرہ سو سال پہلے ہمارے مرکزِ ملت نے اپنے زمانہ کے لئے تجویز کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج ہماری ضروریات کا ساتھ نہیں دے رہا۔

(۱۲) موجودہ مصائب اور اس تعطل وجمود کا حل فقہ اور حدیث سے بغاوت نہیں ہے بلکہ مرکزِ ملت کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا اور تحقیق وتدقیق کے بند دروازوں کو پھر سے کھول کر متقدمین کے خطوط پر ان کے کارناموں کو مزید ترقی دینا ہے۔

(۱۳) جب تک مرکزِ ملت صحیح بنیادوں پر قائم نہ ہو جائے اس وقت تک کے لئے موجودہ مجموعۂ قوانین امت کا صحیح ضابطۂ زندگی ہے۔ اس سے بغاوت کرنا امت میں تشتت وانتشار پیدا کرنا ہے جس کا مفسدہ موجودہ مفاسد سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

(۱۴) انفرادی حیثیت سے افراد کو قانون سازی کا حق دینے سے جو مفاسد پیدا ہوئے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اس لئے ہمیں وہی غلطی دوبارہ نہیں کرنی چاہئے اور آج کل جو بعض علماء ان کوششوں میں لگے ہوئے ہیں انہیں سختی سے روکنا چاہئے۔

استدراک

"ایک اہم سوال" کے جواب میں ہمیں جو کچھ موصول ہو رہا ہے اسے ہم من وعن شائع کئے جا رہے ہیں تاکہ اربابِ فکر کے تمام خیالات قارئین کے سامنے آجائیں۔ لیکن مضمون زیرِ نظر میں محترم عثمانی صاحب نے طلوعِ اسلام کے ایک خاص مسلک پر نکتہ چینی فرمائی ہے، جس کے متعلق طلوعِ اسلام کے لئے ضروری ہے کہ اپنا موقف واضح کرے۔ یہ ہے اس استدراک کی ضرورت اور وجہ جواز۔

قارئین طلوعِ اسلام نے دیکھا ہوگا کہ محترم عثمانی صاحب نے اپنے مضمون میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ کم وبیش وہی ہے جو طلوعِ اسلام کی طرف سے شروع ہی سے پیش ہوتا چلا آ رہا ہے۔ زیادہ نہیں، اگر محض "اسلامی نظام" کے عنوان سے شائع شدہ مضمون ہی سامنے رکھ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اس میں اور محترم عثمانی صاحب کے مضمون میں کچھ بھی فرق نہیں۔ جہانتک حدیث کا تعلق ہے اس میں بھی یہی لکھا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے قرآنی اصولوں کی جو جزئیات مرتب فرمائیں وہ اپنے زمانہ کے تقاضوں کی تسکین کے لئے تھیں، ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے نہیں تھیں۔ اس لئے نہ حضورؐ نے اور نہ صحابہ نے انہیں محفوظ

طور پر آگے منتقل کرنے کی کوشش فرمائی۔ باقی رہے ہمارے موجودہ مجموعہ ہائے احادیث، سو یہ انفرادی کوششوں کے نتائج ہیں اور ان کی حیثیت تاریخ دین کی ہے۔ یعنی ان میں جن احادیث کو صحیح بھی سمجھ لیا جائے ان سے بھی زیادہ سے زیادہ یہ مفہوم ہے کہ اس زمانہ میں فلاں قرآنی اصول کی جزئیات کس طرح متعین ہوئی تھیں۔ جیسا بعینہٖ محترم عثمانی صاحب نے لکھا ہے۔

سو اگر طلوعِ اسلام کا یہ مسلک "انکارِ حدیث" کہلا سکتا ہے تو عثمانی صاحب خود "منکرِ حدیث" ہیں۔ اس کا ثبوت بہت آسان ہے۔ ہم محترم عثمانی صاحب سے عرض کریں گے کہ وہ اپنے اس مضمون کو کسی اہلِ حدیث عالم کے پاس بھجوا دیں اور ان سے دریافت فرمائیں کہ عثمانی صاحب کے مسلکِ حدیث کے متعلق ان کا کیا خیال ہے! آپ خود دیکھ لیں گے کہ وہاں سے عثمانی صاحب کے متعلق منکرِ حدیث کا فیصلہ صادر ہوتا ہے یا ان کا شمار حدیث ماننے والوں میں ہوتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک "حدیث ماننے والا" صرف وہ ہے جو احادیث کو دین سمجھے اور ان میں قیامت تک کسی تغیر و تبدل کو جائز قرار نہ دے۔ (نفسِ حدیث تو ایک طرف، وہ تو احادیث کے موجودہ مجموعوں میں بھی کسی تغیر و تبدل کو روا نہیں قرار دیتے)۔

لہذا اگر طلوعِ اسلام کا یہ مسلک انکارِ حدیث ہے اور خواہ مخواہ کی ضد پر مبنی، تو محترم عثمانی صاحب خود اس جرم کے مرتکب ہیں۔ ہم ایک مرتبہ پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حدیث کے متعلق طلوعِ اسلام کا مسلک وہی ہے جو محترم عثمانی صاحب نے اپنے مضمون میں بیان فرمایا ہے۔ اگر اس کا نام "انکارِ حدیث" یا "فقہ و حدیث سے بغاوت" ہے تو۔ ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

پھر، یہ مسلک بھی طلوعِ اسلام ہی کا پیش کردہ ہے کہ امت کے لئے جزئیات کا مرتب کرنا افراد کا کام نہیں، مرکزِ ملت کا کام ہے۔ اور جب تک مرکز قائم نہ ہو جائے امت کو انتشار سے بچانے کے لئے کوئی نیا فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہیئے۔

لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب طلوعِ اسلام اسی مسلک کا نقیب بن کر سامنے آتا ہے تو محترم عثمانی صاحب کو دکھ کیوں ہوتا ہے اور وہ اسے تخریبی کوشش کیوں تصور کرتے ہیں، جبکہ ان کا خود اپنا مسلک بھی یہی ہے۔

اب رہا عثمانی صاحب کا یہ اعتراض کہ متاخرین میں جو لوگ صاحبِ بصیرت ہیں، وہ اس مسلک کی بنا پر منکرینِ حدیث مشہور ہو چکے ہیں، اس لئے ان کی آواز ایک طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جس کا انھیں بے حد افسوس ہے، سو اس کے متعلق ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد عثمانی صاحب خود اپنے متعلق جو کچھ سنیں ذرا اسے بھی اپنے سامنے رکھیں۔ اس کے بعد انھیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ یہ "متاخرین" حضرات کس حد تک مجرم ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طعن و تشنیع اور جرم و سزا کی تمام ذمہ داری اس جمود و تعطل کے سر عائد ہوتی جسے عثمانی صاحب نے وجۂ زوالِ امت قرار دیا ہے۔ جمود و تعطل کے معنی یہ ہیں کہ قوم تقلیدِ جامد کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے اور ہر اس آواز کو جو انھیں اس دلدل سے نکالنے کے لئے اٹھتی ہے، پیامِ موت سمجھتی ہے۔ انقلاب، تقلید کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ جب آپ تقلید کی سلوں کو توڑنے کے لئے اٹھیں گے تو چاروں طرف سے آپ کی مخالفت شروع ہو جائے گی۔ عقائد، خواہ کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں، انسان کی متاعِ عزیز ہوتے ہیں۔ انقلاب کی آواز کے معنی یہ ہیں کہ تقلیدِ جامد کے پیدا کردہ غلط معتقدات کو چھڑا دیا جائے۔ لہٰذا اس آواز کی مخالفت ضروری ہے۔ لیکن تقلید چونکہ مبنی بر بصیرت نہیں ہوتی اس لئے یہ مخالفت دلائل و براہین کے ساتھ سامنے نہیں آتی۔ اس کے لئے ان کے پاس ایک نہایت سہل سی ترکیب ہوتی ہے۔ انھوں نے کچھ لیبل تراش رکھے ہیں۔ جونہی کہیں سے اس قسم کی آواز اٹھی، انھوں نے جھٹ سے ایک لیبل لگا دیا۔ بس یہ "فتویٰ کفر" اس آواز کا گلا گھونٹنے کے لئے کافی ہے۔ آپ مسلمانوں کی تاریخ پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس تمام عرصۂ جمود و تعطل میں جس کسی نے، کسی ایک شعبہ میں اصلاح و انقلاب کی آواز اٹھائی، کس کس قسم کے لیبل اس پر چسپاں کئے گئے۔ یہی لیبل اب ان حضرات پر لگائے جا رہے ہیں جو دین میں اصول و جزئیات کی صحیح پوزیشن متعین کرنے کے لئے آواز اٹھا رہے ہیں۔ "مقبولیتِ عامہ" بڑی خوش آئند اور نگاہ فریب روش ہوتی ہے۔ اس میں نہ دل و دماغ پر کبھی زور دینا پڑتا ہے نہ سعی و عمل کے لئے کوئی وقت، صرف کرنا یہ ہوتا ہے کہ جس رو میں عوام بہے جا رہے ہیں اسی کے ساتھ آپ بھی بہے جائیے۔ ساری دنیا کی تعریف و ستائش آپ کے لئے ہوگی۔ ان متاخرین حضرات کے سامنے بھی یہ روش، اپنی تمام جاذبیتوں کے ساتھ کھلی تھی۔ اگر یہ چاہتے تو مقبولیتِ عامہ ان کے پاؤں چومتی۔ لیکن یہ ان کا بہت بڑا ایثار تھا کہ انھوں نے اس راہ کو ٹھکرا کر وہ راستہ اختیار کیا جس کی کیفیت یہ تھی کہ — صد منزل است و منزلِ اول قیامت است۔

اس راہ میں طعن و تشنیع اور تکفیر و تفسیق تو سب سے پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن آپ ذرا سوچئے کہ اگر یہ حضرات اس طعن و تشنیع سے ڈر کر اس روش کو چھوڑ دیتے تو جمود و تعطل کی یہ برفانی سلیں ٹوٹتیں کس طرح؟ یہ ان کے اخلاص و ایثار ہی کا صدقہ ہے کہ آج فضا میں یہ آوازیں گونجتی سنائی دے رہی ہیں کہ مرکزِ ملتِ اسلامیہ قرآن کے اصولوں کی روشنی میں جو جزئیات متعین کرے گا وہی مسلمانوں کی شریعت ہوگی۔ آپ سوچئے کہ آج سے دس بیس برس ادھر، اس تصور کا کوئی خاکہ بھی کہیں ملتا تھا؟ یا انہی حضرات کی ہمت اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ قوم کے فکر کا رخ بدل گیا ہے۔ دنیا میں انقلاب انہی کی کوششوں سے رونما ہوا کرتا ہے جو طعنوں اور ملامتوں سے نہیں ڈرا کرتے۔ لہٰذا ہمیں ان حضرات کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے یہ تمام تیر و نشتر اپنے اوپر لے اور ہمیں اس اسلام سے از سر نو روشناس کرایا جو آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیا میں آیا تھا اور اس کے بعد اس طرح نگاہوں سے غائب ہو گیا تھا جیسے چاند گہن میں آ جائے۔ طلوعِ اسلام کیلئے یہ فخر کچھ کم نہیں کہ ان حضرات کے ان انقلاب آفریں خیالات کی ترجمانی کا شرف اس کے حصہ میں لکھا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

میثاقِ خداوندی

عام طور پر قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی حکومت کی ملازمت اختیار کرتا ہے تو اسے ایک ایسا منشور دیا جاتا ہے جس میں اس کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کی تصریح اور اس کے حقوق و واجبات کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ اسے کہا جاتا ہے کہ وہ اس منشور کی ایک ایک شق کو بغور پڑھے اور اس کے بعد اپنے عرصۂ ملازمت میں ان پر کاربند رہے۔ گویا یہ منشور ایک عہد نامہ ہوتا ہے جو حکومت اور اس کے عمال کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں اگر کہیں اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کے عمال کو کس قسم کے منشورِ حقوق و فرائض کا پابند ہونا پڑے گا اور وہ کونسا عہد نامہ ہوگا جس کی پابندی ان پر لازم ہوگی۔ اس منشور کی ترتیب کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی حکومت کا مدار قرآنی آئین پر ہوگا اور قرآن نے ان تمام فرائض و واجبات کی بھی تصریح کر دی ہے جو اس حکومت کے اربابِ نظم و نسق پر عائد ہوں گے لہٰذا یہ منشور قرآن کے مطالعہ سے بآسانی مرتب ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی قسم کے منشور کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ عمالِ حکومت اسلامیہ کا یہ عہد نامہ، ان کے اور حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ (یعنی ان کے خدا) کے مابین ہوگا اس لئے ہم نے اس کا عنوان میثاقِ خداوندی مناسب سمجھا ہے۔

یہ میثاق یوں مرتب کیا جا سکے گا۔

۱۔ بنیادی اصول تم ایک ایسی حکومت کے اربابِ حل و عقد کے زمرہ میں داخل ہو رہے ہو جو اس ابدی صداقت پر قائم ہے کہ

حکومت کی سزاوار صرف خدا کی ذات ہے۔ (۱۲/۴۰)

اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمہیں اپنے تمام معاملات اور کاروبار، احکام اور فیصلوں میں ان غیر متبدل قوانین کی اتباع کرنی ہوگی جو خدائے حکیم و بصیر نے، انسانی معاملات کے حل اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے مرتب فرمائے ہیں۔ اور اس اصل الاصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا ہوگا کہ تم اپنے ہر کام کے لئے اس خدا کے سامنے جوابدہ ہوگے۔

جو نگاہ کی خیانت اور دل کے رازوں تک سے باخبر ہے۔ (۴۰/۱۹)

تم یہ عہد اپنے خدا کے ساتھ استوار کر رہے ہو اور [illegible] اچھی طرح سمجھ لو کہ اس کو ہر حالت میں نباہنا ہوگا، وہ خدا جس کا ارشاد ہے کہ

نصیحت وہ صاحبانِ علم و عقل [illegible] کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو کبھی نہیں توڑتے۔ ( )

۲۔ مقصدِ اولیٰ | تمہاری زندگی کا بنیادی اصول

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ (۳۲/۲۲)

ہونا چاہیے۔ یعنی خدا کے احکام کی تنفیذ۔ جس چیز کا اس نے حکم دیا ہے، اس حکم کا رائج کرنا اور جس سے اس نے منع کیا ہے، اس سے لوگوں کو روکنا۔

۳۔ عمل

اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ضروری ہوگا کہ پہلے تم خود ان احکام کی پابندی کرو۔ اگر تمہارے قول اور فعل میں تضاد اور احکام اور سیرت میں تخالف ہوگا، یعنی جو حکم تم نافذ کروگے اس کی شہادت خود تمہارے عمل سے نہ ملے گی، تو وہ ایمانداری نہیں، منافقت ہوگی اور حکومتِ خداوندی میں منافقین کا کوئی کام نہیں۔ اس حکومت کا تو پہلا حکم یہ ہے کہ

اے ایمان والو! تم وہ کچھ کہتے کیوں ہو جو کچھ خود کر کے نہیں دکھاتے! یاد رکھو۔ اللہ کے نزدیک یہ طرزِ عمل نہایت مبغوض ہو کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جس کی تائید تمہارے عمل سے نہ ہو رہی ہو۔ (۶۱/۲-۳)

۴۔ عدل

تمہیں لوگوں کے مقدمات میں حَکَم بننا ہوگا۔ ان کے نزاعی امور کے فیصلے کرنے ہوں گے۔ لوگ اپنے معاملات تمہارے پاس لائیں گے۔ اس باب میں ہمیشہ یاد رکھو کہ

اللہ کا حکم یہ ہے کہ۔۔۔ جب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرو تو ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لو۔ (۴/۵۸)

خواہ یہ فیصلہ تمہارے دوستوں یا رشتہ داروں کے بھی خلاف کیوں نہ جائے۔ کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ

جب تم بات کرو تو عدل و انصاف کی کرو، خواہ وہ تمہارا قریبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور (اس طرح) اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ (۶/۱۵۲)

بلا لحاظ اس امر کے کہ فریقِ متعلقہ امیر ہے یا غریب حتیٰ کہ اس کی زد خواہ تمہاری اپنی ذات پر بھی کیوں نہ پڑے۔

اے ایمان والو! انصاف کی پوری محافظت کرنے والے اور فقط اللہ کی خاطر شہادت دینے والے بنو۔ خواہ معاملہ خود تمہاری اپنی ذات، ماں باپ یا قریب رشتہ داروں کے خلاف

ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ غریب ہو یا امیر اللہ کا دونوں پر (تمہارے رجحانات کی نسبت) زیادہ حق ہے۔ سو تم اپنے رجحانات و میلانات کی پیروی مت کرو تاکہ تم عدل کر سکو۔ اگر تم سچائی سے اعراض برتو گے یا گول مول بات کرو گے تو یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (۴/۱۳۵)

عدل! نہ صرف اپنے لوگوں کے ساتھ ہی بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل۔

اے ایمان والو! اللہ (کے عہد نامہ کی) حفاظت کرنے والے اور انصاف کی شہادت دینے والے بن جاؤ۔ (یاد رکھو) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ (ہر حال میں اور ہر شخص کے ساتھ) انصاف کرو۔ یہی روش، تمہارے فرائض سے قریب تر ہے۔ (۵/۸)

صرف عدل ہی نہیں، بلکہ مستحق لوگوں سے احسان بھی کرو۔ کیونکہ

(تمہارا) اللہ، عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔ (۱۶/۹۰)

۵۔ امانت یاد رکھو! اس ادارۂ حکومت کی رکنیت قبول کرکے تم نے ایک بارِ عظیم اپنے ذمے لے لیا ہے یہ خدا کی امانت ہے۔ اس امانت کو نہایت دیانتداری سے پورا کرنا۔ اور اس طرح سے باہمی امانات کو بھی۔

اگر تم میں سے ایک شخص دوسرے کا اعتماد کرتا ہے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہیئے کہ اپنی اس امانت کو بحسن و خوبی پورا کرے۔ (۲/۲۸۳)

اس لئے کہ تمہارے خدا کا یہ حکم اور بھی واضح ہے کہ

امانات کو ان کے اہل تک پہنچایا کرو۔ (۴/۵۸)

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر منصب اور عہدہ کے لئے معیارِ انتخاب اہلیت و قابلیت ہونا چاہیئے نہ کہ اعزہ نوازی و اقرباپروری۔ مناصب و مدارج جن کا انتخاب تمہارے ذمہ رکھا گیا ہے، خدا کی امانات ہیں ان امانات کو ان لوگوں تک پہنچاؤ جو اس کے اہل ہوں۔ نااہل لوگوں کو بھرتی نہ کئے جاؤ۔

جن جن معاملات میں تم پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس اعتماد میں پورے اترو۔

اور اپنے اعتماد کو ہمیشہ نبھاؤ کیونکہ تم جانتے ہو (کہ اعتماد شکنی غداری ہے اور غداری سے قومیں تباہ ہو جایا کرتی ہیں) (۸/۲۷)

اور شر انگیز سازشوں میں نہ الجھو کیونکہ مآل کار

شر انگیز سازش خود اس کو پھانس لیا کرتی ہے جو اسے وضع کرتا ہے۔ (۳۵/۴۳)

۶۔ باہمی تعاون حسنِ نظم و نسق کا راز باہمی تعاون میں ہے لیکن تعاون فلاح و بہبود کے کاموں میں ہونا چاہیئے نہ کہ فتنہ و فساد کے کاموں میں۔ لہذا

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون کرو۔
برائی اور سرکشی کے معاملات میں تعاون نہ کرو۔ (۵/۲)

تم تمام عمالِ حکومت، ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی مشین کے پرزے ہو، اس لئے تم میں باہمی رقابتیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہرگز ہرگز نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر تمہیں بعض مصالح وقت کی بنا پر

باہمی خفیہ مشورے بھی کرنے ہوں تو یہ مشورے جرم و بغاوت کے مشورے نہیں ہونے چاہئیں۔
بلکہ نیکی اور تقویٰ کے مشورے ہونے چاہئیں۔ (۵۸/۹)

اور نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ کوئی کہے تو دستِ معاونت بڑھایا جائے بلکہ خود بخود آگے بڑھو اور دوسروں کو اس میں شریک ہونے کی تاکید کرو۔ اس لئے کہ کامیابی انہی کے لئے ہے

جو حق و استقامت کی تلقین و تائید کرتے رہتے ہیں۔ (۱۰۳/۳)

ہر ایک کو اپنا اپنا کام اپنی صوابدید کے مطابق کرنے دو۔ خواہ مخواہ دوسروں کے شعبوں میں دخل اندازی نہ کرو۔ لیکن اگر دیکھو کہ کسی معاملہ میں آپ کا کوئی ہم جلیس حقیقتِ حال سے بے خبر ہونے کی وجہ سے غلط فیصلہ کر رہا ہے تو اسے اصل حالات سے باخبر کر دو۔ اس قسم کی دخل اندازی (سفارش) موجب فلاح و فوز ہوگی۔ اس لئے کہ

جو کوئی بھلی بات میں سفارش کرے گا تو اس کو اس میں سے حصہ ملیگا۔ اور جو کوئی برائی کی
سفارش کرے گا تو اس کی پاداش میں بھی اس کا حصہ ہوگا۔ (۴/۸۵)

۷۔ نظم و نسق معاملات کے فیصلے یونہی اڑتی ہوئی خبروں پر نہ کر دیا کرو۔ بلکہ ذاتی تحقیق کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچا کرو۔ اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے کہ

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو تم سے تمام ذرائع علم یعنی سماعت
اور بصارت اور قلب کے متعلق بازپرس ہوگی۔ (۱۷/۳۶)

اور جب تم کسی معاملہ میں پوری تحقیق و تفتیش کے بعد ایک نتیجہ تک پہنچ جاؤ تو پھر تذبذب میں نہ پڑو بلکہ عزمِ راسخ سے اسے نافذ کر دو اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

اور جب تم عزم کر لو تو پھر خدا پر بھروسہ کر کے (اس فیصلہ کو نافذ کر ڈالو) (۳/۱۵۸)

اور اس راہ میں جس قدر مشکلات و موانع کا سامنا ہو، نہایت دلجمعی اور ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے جاؤ۔

جو کچھ تم پر آئے ہمت سے مقابلہ کرو۔ یاد رکھو، ثابت قدمی عزم الامور میں سے ہے۔ (۳۱/۱۷)

اگر فتنہ پردازوں اور فساد انگیزوں کا سامنا ہو تو انہیں اپنے حسنِ سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔

برائی کی مدافعت، نیکی سے کر۔ (۴۱/۳۴)

اگر وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو انہیں ان کے جرائم کی قرار واقعی سزا دو کہ

جرم کی سزا اس کے مطابق ہونی چاہیے۔ (۴۲/۴۰)

اگر اس کے بعد دیکھو کہ وہ اپنے کئے پر نادم ہیں اور آئندہ کے لئے اپنی غلط روش میں اصلاح کرنے پر بحسنِ نیت آمادہ، تو انہیں ان کی سابقہ غلطیوں پر معاف کر دو کہ یہ بھی خدا کا حکم ہے کہ

تم میں سے جو شخص غلطی کرے اور پھر اس پر نادم ہو جائے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ( )

یاد رکھو۔ لوگوں سے معاملہ داری میں اپنی طبیعت کو بے قابو نہ ہونے دو کہ

جو لوگ اپنے غصہ کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور لوگوں (کی ندامت پر انہیں) معاف کر دیتے ہیں تو اللہ (ایسے حسنِ عمل کو) محبوب رکھتا ہے (۳/۱۳۴)

۸۔ انتخابِ رفقائے کار

جب بھی کسی مقصد کے لئے کسی کو متعین کرو تو پہلے دیکھ لو کہ وہ اس مقصد کے لئے موزوں بھی ہے۔ اس موزونیت کے لئے جسمانی اور قلبی دونوں صلاحیتیں ضروری ہیں کہ

بہترین اجیر وہ ہے جو جسمانی طور پر مضبوط اور امین ہو۔ (۲۸/۲۶)

جب اللہ نے حضرت طالوت کو سرداری کے لئے منتخب کیا تھا تو اس انتخاب کی دلیل یہی دی تھی کہ ان میں

علمی قابلیت اور جسمانی توانائی، دونوں وافر طور پر موجود ہیں۔ (۲/۲۴۷)

انہیں تمام معاملات نہایت نرمی، خندہ پیشانی اور وضاحت سے سمجھاؤ۔

انہیں اللہ کی راہ کی طرف حکمت اور موعظت سے بلاؤ اور جب بحث کرو تو عمدہ دلائل سے کرو (۱۶/۱۲۵)

اسے کبھی فراموش نہ کرو کہ اختلافِ مدارج، محض تقسیمِ کار کے لئے ہے۔ جنہیں تم اپنے ماتحت سمجھتے ہو وہ ذلیل نہیں ہیں۔ جس طرح تمہیں ایک کام سونپا گیا ہے اسی طرح ان کے سپرد بھی ایک فریضہ کیا گیا ہے۔ عزت کا معیار یہ ہے کہ تم میں سے کون اپنے فرائض کو بحسن و خوبی سرانجام دیتا ہے۔

خدا کی نگاہ میں تم میں سے سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے بہتر طریق پر اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ (۴۹/۱۳)

اپنے ماتحتوں کے آرام اور آسائش کا ہمیشہ خیال رکھو اور اس کا اطمینان کرو کہ انھیں ان کے کام کا پورا پورا معاوضہ مل رہا ہے۔

اور جب ناپو تو ماپ کو پورا کرو۔ اور سیدھے ترازو سے تولو۔ یہ بہت عمدہ روش زندگی اور مآل کار بہترین نتائج کی حامل ہے۔ (۱۷/۳۵)

۹۔ حسن سلوک | تم خلق خدا کے خدمت گذار رہو۔ لوگ تمہارے پاس اپنی شکایات لیکر آئیں گے۔ ان سے بے رخی نہ برتو۔ (۳۱/۱۸)

خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرو اور

جب تمہیں کوئی ہدیۂ سلام پہنچائے تو (اول تو) اس سے بہتر طریق پر جواب دو (ورنہ کم ازکم) ویسا جواب تو ضرور دو۔ یاد رکھو اللہ ان تمام باتوں کا خیال رکھتا ہے (کہ سیرت کی تعمیر انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے) (۴/۸۶)

ان سے جوبات بھی کرو صاف، واضح، اور اس طریق سے کرو کہ وہ سیدھی ان کے دل تک اتر جائے۔ (۴/۶۳) اور ہمیشہ نرمی سے گفتگو کرو (۱۷/۲۸) کبھی مبہم اور ذومعنی باتیں نہ کرو۔ (۳۳/۷۰) جھوٹ کبھی نہ بولو۔ (۲۲/۳۰) اگر کوئی بات صیغہ راز میں رکھنے کی ہے تو کہدو کہ اسے نہیں بتایا جا سکتا۔ خواہ مخواہ جھوٹ کو سچ کا لبادہ فریب۔ نقاب نہ اڑھاؤ۔

کبھی حق کا باطل کے ساتھ التباس نہ کرو نہ ہی جان بوجھ کر سچ کو چھپاؤ۔ (۲/۴۲)

جب وعدہ کرو تو ہمیشہ اس کا ایفا کرو (۱۷/۳۴) نرم خو رہو اور

اکڑ کر نہ چلو۔ اللہ شیخی خورے متکبر کو پسند نہیں کرتا۔ (۳۱/۱۸)

لوگوں سے "چیخ کر نہ بولو" (۳۱/۱۹)۔ یاد رکھو

سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی ہے۔ (۳۱/۱۹)

تمہاری سوسائٹی کی عام حالت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں

ایک جماعت دوسری جماعت کی ہنسی نہ اڑائے۔ . . . . . نہ ہی ایک دوسرے پر بہتان لگائے۔ نہ ان کے نام دھرتے رہو۔ . . . . بدظنی سے ہمیشہ مجتنب رہو۔ بعض وقت بدظنی جرم تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسروں کی ٹوہ میں نہ لگے رہو۔ نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ (۴۹/۱۱-۱۲)

اگر کسی نے اپنے علم و عمل سے کسی مقام بلند کو حاصل کر لیا ہو تو اس کا حسد نہ کرو۔ (۴/۳۲) بلکہ کوشش کرو کہ تم بھی علم اور محنت سے اس قسم کا مقام حاصل کر لو کہ حکومت اسلامی میں

ہر شخص کو اس کی کوشش کا صلہ ملتا ہے۔ (۵۳/۳۹)

۱۰۔ **مختصراً** اپنے تمام ارادوں اور فیصلوں، کاموں اور تدبیروں میں ہمیشہ اس اصل اصول کو پیش نظر رکھو کہ جس حکومت کی مشینری کے تم پرزے ہو اس کا قیام اس مقصد کے حصول کیلئے عمل میں لایا گیا ہے کہ

وہ قیام صلوٰۃ (یعنی شرفِ انسانیت کے ارتقاء کا ذریعہ بنے) ادائے زکوٰۃ (یعنی تمام لوگوں کی معاشی ضروریات کی بہترین کفیل ہو) ہمیشہ نیکی کو پھیلانے اور برائی کو روکنے کی تدابیر کرے اور تمام امور میں خدا کی طرف رجوع کرے۔ (۲۲/۴۱)

اور کبھی یہ نہ کہو کہ جب دوسرے لوگ غلط راہ پر چل رہے ہیں تو ہم بھی کیوں نہ ان ہی کی راہ چلیں۔ یاد رکھو۔

تم پر (سب سے پہلے) تمہاری اپنی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جو غلط راہ پر چل رہا ہے وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اگر تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو تو۔ تم سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے (اسلئے کہ تم، تمام اراکینِ حکومتِ خداوندی، اپنے معاملات میں خدا کے سامنے جوابدہ ہو)۔ وہ تم سب کو بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کیا کرتے تھے۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس منشور کا جو اسلامی حکومت کے عمال کو دیا جائے گا کہ وہ اس کے مطابق کام کریں۔ اور یہ ہے وہ عہد نامہ جس پر انہیں کاربند رہنا ہوگا۔

کس قسم کی جنت ہوگی وہ سرزمین جس پر ایسی حکومت قائم ہو جس کے عہدیدار اراکین اور اربابِ بست و کشاد اس میثاق خداوندی پر عامل ہوں۔

بارالہا! کیا اس قسم کی حکومت اب کہیں بھی قائم نہ ہوگی؟
کیا چالیس کروڑ قرآن پڑھنے والوں میں سے کوئی جماعت بھی نہیں نکلے گی جو اپنے عمل سے وہ کچھ کر دکھائے جس کا دعویٰ وہ اپنی زبان سے کرتے ہیں؟

یا مالک الملک! ایک مرتبہ تو پھر اس حکومت کا تختِ اجلال اس دنیا پر کہیں بچھ جائے!

الہٰی تو تو رب العالمین ہے!

سلیم کے نام...

(کمیونزم)

لا و الّا سازو برگِ اُمتاں
نفی بے اثبات، مرگِ امتاں

میں سلیم! تمہیں ایک عرصہ سے کہتا چلا آ رہا تھا کہ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کی مختلف تحریکوں کے پس منظر، نفسیاتی اسباب و علل اور سیاسی محرکات و موجبات سے آگہی حاصل کرو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ لاعلمی، یا سطحی معلومات کی وجہ سے تم بھی اس طوفان میں بہہ جاؤ گے۔ جس میں ہمارے ملک کے نوجوان عام طور پر بہے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لیکن چونکہ تمہاری فطرت سلیم ہے اس لئے تم نے پاؤں اکھڑنے سے پہلے آواز دیدی۔ اب مجھے امید ہے کہ تم سنبھل جاؤ گے۔ ورنہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں ہر ایک کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جس سے پوچھئے وہ کمیونزم کے متعلق اتنا ہی جانتا ہے کہ یہ ایک معاشی نظام کا نام ہے، جس میں تمام لوگوں میں دولت کی تقسیم مساویانہ ہوتی ہے اور امیر و غریب، مزدور اور سرمایہ دار، زمیندار اور کاشتکار کا امتیاز مٹ جاتا ہے، جس سے سب خوش حال اور مرفہ الحال ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دار کسی غریب کا خون نہیں چوس سکتا اور غریب محض پیٹ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنی جان تک اہلِ دولت کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتا۔ اور یوں، یہ دنیا جو اس وقت سرمایہ داری کی لعنت سے غریبوں کے لئے جہنم بن رہی ہے، مسرت و اطمینان کی جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ معاشی نظام کا یہ منظر ایسا خوش آئند ہے کہ ہر شخص رواں دواں اس کی طرف کھنچے چلا جاتا ہے اور یہ نگاہ فریب جاذبیتیں اسے اتنی فرصت ہی نہیں دیتیں کہ وہ اس کے گرد و پیش پر ایک نظر ڈال سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کی لعنت نے فی الواقعہ جمہور کو اس قدر ستا رکھا ہے کہ ان بھوکوں، محتاجوں اور بےکسوں کو جہاں کہیں سے روٹی کا اشارہ ملتا ہے یہ اس کی طرف لپک کر جاتے ہیں۔ اور اس باب میں یہ سچے بھی ہیں۔ بھوکے میں اس کی تاب ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی تحقیق کرے کہ جو حلوہ اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس میں کہیں زہر تو نہیں ملا رکھا۔ بھوک کی ایسی جانگسل شدت میں اس تمیز کا ہوش رکھنا، کار ہر دیوانہ نیست۔ یہ ایسی صورت ہے میں ممکن ہے کہ انسان کے نزدیک، جان سے بھی زیادہ کوئی اور متاع ہو۔ موجودہ معاشرہ میں ایسی متاعِ عزیز کی تلاش، سعی لاحاصل ہے کہ اس معاشرہ کی بنیاد ہی "روٹی" پر استوار ہے۔ اس لئے ہمارے دور کا بھوکا مجبور و معذور ہے کہ وہ "روٹی" کی آواز پر لبیک کہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تحریکوں کی کامیابی کا راز ان تحریکوں کے ذاتی جوہروں (Intrinsic values) میں نہیں بلکہ ان حالات میں ہے جو ہمارے دور کے ابلیسی نظام نے پیدا کر رکھے ہیں۔ اس نظام میں غربت اور فلاکت نے جس درجہ کی شدت اختیار کر رکھی ہے اس کے پیش نظر اگر ہر غریب "پیدائشی کمیونسٹ" دکھائی دیتا ہے تو یہ کچھ تعجب انگیز نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ فطرت نے تمہیں ایک نہایت دردمند دل عطا فرمایا ہے جو ہر مظلوم کی مصیبت پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس لئے تمہارے لئے ان غریبوں کی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہونا بھی مستبعد نہ تھا۔ لہذا مجھے اس کے متعلق بھی کوئی شکایت نہیں۔ وہ بدبخت شقی القلب ہے جو غریبوں اور مفلسوں کی مظلومیت پر خون کے آنسو نہ بہائے اور ان کے دکھ کی دوا ڈھونڈنے میں دن اور رات کی تمیز روا رکھے۔ لیکن مجھے جس بات کا افسوس ہے وہ صرف یہ ہے کہ تم نے اس تحریک کا صحیح مطالعہ نہیں کیا اور اپنی روش کے خلاف، محض جذباتی طور پر اس کے متعلق رائے قائم کر لی کہ "کمیونزم اور اسلام ایک ہی چیز ہے اور اگر اسلام کچھ اور ہے تو ایسے اسلام کو دور ہی سے سلام ہے"۔ تم نے شدت جذبات میں اس اصول کو بھی فراموش کر دیا کہ لا تقف ما لیس لک بہ علم، "جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو"۔ تمہیں چاہئے تھا کہ پہلے اس کے متعلق پوری پوری معلومات حاصل کرتے اور پھر رائے قائم کرتے۔ بہرحال جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے، یہ غنیمت ہے کہ تم نے عملی اقدام سے پہلے اس کے متعلق دریافت کر لینا ضروری سمجھا۔ یہی تمہاری فطرت سلیم کی شہادت ہے۔

کمیونزم معاشی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک پورا فلسفۂ زندگی ہے اور معاشی نظام اس کے ایک گوشے کا مظہر۔ لہذا جب ہم کمیونزم کے متعلق گفتگو کریں تو ہمارے سامنے وہ پورا فلسفۂ حیات ہونا چاہئے نہ صرف روس کا معاشی نظام۔ "فلسفۂ حیات" کے معنی یہ ہیں کہ ہم زندگی کو کیا سمجھتے ہیں اور وہ کونسی اقدار (VALUES) ہیں جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ جس طرح کمیونزم ایک فلسفۂ زندگی ہے اسی طرح اسلام بھی ایک فلسفۂ زندگی ہے۔ لہذا یہ کہنے سے پہلے کہ کمیونزم اور اسلام ایک ہی چیز ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کیا ان دونوں کا فلسفۂ حیات ایک ہی ہے۔ اگر ایک ہی ہے تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ لیکن اگر ان کے فلسفے مختلف ہوں تو یہ کہنا یکسر غلط ہوگا کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے معاشی نظام اور کمیونزم کے معاشی نظام میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن اتنے سے تشابہ سے یہ دونوں ازم (isms) تو ایک نہیں ہو سکتے! یہ تو ایسے ہی ہے جیسے تم کہہ دو کہ ہندوستان کی حکومت نے امتناع شراب کا حکم دے دیا ہے لہذا وہاں کی حکومت "اسلامی حکومت" ہے۔ یا یہ کہ مرزا ارشد کی شکل حمید ریحانی سے بہت ملتی ہے اس لئے ان دونوں کی فطرت بھی ایک ہی ہے۔ بعض اجزا کے

تشابہ ہے کل یا ظواہر کے تشابہ سے اصل کی یکسانیت لازم نہیں آتی۔

مشکل یہ ہے کہ تم فلسفہ کے مبادیات سے بھی واقف نہیں ہو۔ اس لئے تم سے فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ یہی اس دشواری کے پیش نظر تم سے کبھی فلسفیانہ انداز میں گفتگو نہیں کی۔ لیکن جس بات کا مدار ہی فلسفہ پر ہو اس کے متعلق کیا کیا جائے؟ میں کوشش کروں گا کہ فلسفیانہ اسلوب سے بچ کر، عام فہم زبان میں بات سمجھائی جا سکے۔

کمیونزم کو مارکس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مارکس ایک فلسفی تھا لیکن اس کا فلسفہ متفرع تھا ہیگل کے فلسفہ پر۔ لہٰذا مارکس تک پہنچنے کے لئے ہیگل کے فلسفہ کے متعلق دو چار باتیں جاننا نہایت ضروری ہیں۔ ہیگل (Hegel) کے فلسفہ کو عام طور پر فلسفۂ اضداد (Opposites) کہا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہتا ہے کہ دنیا میں ہر شے اپنی ضد سے قائم ہے بلکہ یہ بھی کہ انسانیت نے جس قدر ترقی کی ہے وہ اضداد ہی کی جنگ و پیکار سے کی ہے۔ لیکن ان اضداد کا دائرہ صرف تصور اور فکر (Ideas & Thoughts) کی دنیا تک محدود ہے۔ محدود ہی نہیں بلکہ وہ اصل حقیقت صرف تصور کو جانتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ایک تصور (Idea) جب اپنی حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں کے تصادم سے ایک نئے تصور کی تخلیق ہوتی ہے جس سے پہلے تصور کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے وہ دلیل یہ لاتا ہے کہ ہر تصور محدود اور ناقص ہوتا ہے۔ اس نقص اور محدودیت کی وجہ سے وہ اپنی ضد پیدا کرتا ہے۔ یہ نیا تصور اپنے سے پہلے تصور کے ناقص پہلوؤں کا ابطال کرتا ہے۔ لیکن ان ناقص پہلوؤں کا کچھ نہ کچھ اثر اس کے اندر باقی رہتا ہے۔ یہ تصور وسعت اختیار کر لیتا ہے اور پھر اپنی انتہا تک پہنچ کر ایک نئے تصور کی تخلیق کرتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح سے جاری رہتا ہے۔ ہیگل اس عمل کا نام جدلی عمل (Dialectical Process) قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جدلی عمل، زندگی کی عین فطرت ہے۔ ایک مخفی قوت ہے جو انسان کو بار بار اس پر آمادہ کرتی رہتی ہے کہ وہ پرانے تصورات کی جگہ نئے تصورات پیدا کرتا رہے .... جو پہلے تصورات کی نقیض یا ضد ہوں۔ اس مخفی قوت کو ہیگل "روحِ عالم" (World-Spirit) کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ روحِ عالم ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کے متعلق ہیگل کہتا ہے کہ اس سے اس روح کو خود اپنی ذات کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔

تم سلیم! کہو گے کہ یہ لفظوں کا گورکھ دھندا کیا ہے۔ لیکن تم ذرا غور سے دیکھو گے تو تمہیں نظر آجائیگا کہ اسی لفظی گورکھ دھندے کی بنیاد پر زندگی کی پوری کی پوری عمارت قائم کر دی گئی ہے۔ ہیگل کے نظریہ کا ماحصل یہ ٹھہرا کہ

(۱) دنیا میں کوئی قدر (Value) مستقل طور پر اپنا وجود نہیں رکھتی۔ ہر قدر میں نقص موجود ہوتا ہے۔ وہ تغیرات کی دنیا میں چکر کاٹتی ہے اور اس کے بعد ایک نئی قدر پیدا کرتی ہے جو اس کی ضد ہوتی ہے۔ یہ نئی قدر بھی اپنی ذات میں مکمل یا مستقل نہیں ہوتی بلکہ ایک اور قدر کی تخلیق کا پیش خیمہ۔

(۲) یہ سلسلۂ تخریب و تعمیر ایک مخفی قوت کی تحریک پر قائم ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ مخفی قوت اپنی ذات کی تکمیل کر لے۔

(۳) کائنات میں مادہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اس کی بنیاد تصورات (Ideas) پر قائم ہے۔

اس سے نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ

(ل) خدا (مخفی قوت یا روحِ عالم) بھی اپنی ذات میں مکمل نہیں۔ بلکہ وہ تکمیلِ ذات کیلئے تصورات کے تعمیری اور تخریبی چکر میں پھنسا ہوا ہے۔

(ب) دنیا میں مستقل اقدار (Permanent Values) کا کہیں وجود نہیں۔ ہر تصور (قدر) اپنے اندر نقائص رکھتا ہے اور ایک حد تک پہنچکر خود معدوم ہو جاتا ہے اور ایک نئے تصور (قدر) کی تخلیق کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ یہ نئی قدر پھر اپنے اندر نقائص رکھتی ہے اور اس طرح تغیرات کا یہ سلسلۂ حوادث جاری ہے۔ لہذا دنیا میں کوئی شے ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں۔

(ج) دنیا میں جنگ و پیکار صرف تصورات کی ہوتی ہے، مادیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لہذا یا تو مادہ اپنا وجود ہی نہیں رکھتا اور اگر وہ وجود رکھتا ہے تو روح سے یکسر الگ شے ہے۔ ان دونوں میں باہمی امتزاج ناممکن ہے۔

تم کہو گے کہ ان چیزوں کو کمیونزم سے کیا واسطہ؟ اور یہ اس لئے کہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، تم نے کمیونزم کو فقط روس کا معاشی نظام سمجھ رکھا ہے۔ بہرحال ہیگل کے فلسفہ کے ان اصولوں کو سامنے رکھکر آگے بڑھو۔

مارکس (Karl Marx 1818 — 1883) ہیگل کے فلسفہ کا تبع تھا۔ لیکن چار ہی قدم آگے چل کر اس نے ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ ہیگل کا سارا فلسفہ اس کے ہاتھوں تہس نہس ہو گیا۔ اس نے ہیگل سے اس باب میں اتفاق کیا کہ تاریخ جنگِ اضداد کی داستان ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے، جب وہ اپنے عروج کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالف قوتیں وجود کوش ہوتی ہیں۔ یہ مخالف قوتیں، اس نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک جدید نظام مسلط کر دیتی ہیں۔ اور یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

تم نے سلیم! غور کیا کہ مارکس کی اس موافقت میں کتنے بڑے اختلافات کا پہلو نمایاں ہے۔ ہیگل نے کہا تھا کہ ایک تصور (Idea) کی جگہ دوسرا تصور لے لیتا ہے اور یہ جنگِ اضداد، تصورات (Ideas) کی جنگ ہوتی ہے۔ مارکس، جنگِ اضداد کا تو قائل ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ جنگ تصورات کی نہیں، مختلف "نظامہائے عالم" کی ہوتی ہے۔ ہیگل کے نزدیک انقلاب انسانوں کی تصوراتی (داخلی) دنیا میں رونما ہوتا ہے۔ مارکس کے نزدیک داخلی دنیا کا کوئی وجود نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تمام انقلابات انسان کی خارجی دنیا میں رونما ہوتے ہیں اور انسانی تصورات (Ideas) انہی خارجی انقلابات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ یعنی ہیگل کے نزدیک کائنات کی بنیاد تصور (Idea) پر ہے۔ لیکن مارکس کے نزدیک اس کی بنیاد خالص مادہ (Matter) پر ہے۔ ہیگل کے فلسفہ کی رو سے انسان کا خارجی ماحول، اس کے تصور و فکر کی تبدیلی سے بدلتا ہے۔ مارکس کے فلسفہ کی رو سے انسانی فکر و تصور، اس کی مادی دنیا کے تغیرات کے مطابق بدلتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، مارکس نے ہیگل کے جدلی تصور (Dialectical Idealism) سے جدلی طریق (Dialectic) کو تو لے لیا لیکن اس کی تصوریت (Idealism) کو چھوڑ دیا اور اس کی جگہ خالص مادیت کو دے دی۔ اس لئے مارکس کے فلسفہ کو جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کہتے ہیں۔ ہیگل کے نزدیک، اس جنگِ اضداد کی محرک روحِ عالم یا روحِ مطلق (Absolute Spirit) تھی اگرچہ وہ روح نامکمل تھی اور اس نے اس تمام سلسلہ جنگ و پیکار کو اپنی تکمیلِ ذات کے لئے قائم کر رکھا تھا۔ لیکن مارکس نے کہا یہ مطلقیت (Absolutism) انسان کو حاصل ہے۔ انسان کے ماوراء کوئی قوت نہیں۔ مادہ سے توانائی **ازخود** پیدا ہوتی ہے اور یہی ازخود پیدا شدہ توانائی (Self-Generated Energy) کائنات میں حرکت کا موجب ہے۔ یہ ہے مارکس کے فلسفہ کی بنیاد یعنی خالص مادیت۔ مادیت (Materialism) کا لفظ تو تم دن میں سینکڑوں بار سنتے ہوگے لیکن مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ تم اس کے مفہوم سے بھی واقف ہو یا نہیں۔ میں نے ایک دفعہ تمہیں (Haeckel) کی کتاب (Riddle of the Universe) بھیجی تھی۔ خدا معلوم تم نے اسے پڑھ لیا تھا یا وہ بھی ناولوں کے ساتھ کباڑیوں کے ہاں چلی گئی۔ یا نتاری نے چولہے کی نذر کر دی۔ اگر تم نے اسے پڑھا تھا تو تم نے دیکھا ہوگا کہ ہیکل کائنات میں سات معمے بتاتا ہے۔ (۱) مبداءِ حیات۔ (۲) ربطِ اشیائے فطرت (۳) مبداءِ فکر و لسان (۴) انسانی اختیار و ارادہ۔ (۵) ماہیتِ مادہ و توانائی۔ (۶) مبداءِ حرکت اور (۷) مبداءِ شعور۔ ہیکل کے نزدیک یہ سات معمے، دو بنیادی اصولوں کے ماتحت حل ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ "مادہ اور قوت غیر متبدل ہیں" اور دوم یہ کہ "کائنات میں عملِ ارتقاء جاری ہے"۔ جس سے مفہوم یہ ہے کہ غیر شعور و غیر ذی حیات مادہ

(Matter) سے ارتقائی طور پر زندگی (Life) اور شعور (Consciousness) پیدا ہو جاتا ہے۔

چلئے! کائنات کے مسئلے کا حل دریافت ہو گیا!

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

یہ ہے سلیم! مادیت۔ یعنی مادہ ازخود موجود ہو گیا اور پھر عمل ارتقاء سے اس سے زندگی، حرکت، ارادہ، شعور، سب کچھ پیدا ہو گیا۔ جب تک ان اجزا میں ربط باہمی قائم ہے (جس کا نتیجہ زندگی اور شعور ہے) انسان زندہ ہے اور باشعور جب یہ اجزا پریشان ہو جاتے ہیں تو زندگی اور شعور ختم ہو جاتا ہے اور انسان مٹ جاتا ہے۔

جہاں تک فلسفۂ مادیت کا تعلق ہے، مارکس پر ایک اور فلاسفر کا اثر تھا۔ اس کا نام تھا (Ludwig Feuerbach) یہ ہیگل کا شاگرد تھا اور عیسائیت کا بنیادی دشمن۔ عیسائیت کی تخریب کے لئے اس نے فلسفۂ مادیت کی عام ترویج کی۔ اس کی کتاب (Essence of Christianity) اس کے "مذہب" کی "بائبل" ہے۔ اس میں یہ لکھتا ہے کہ "فطرت کے ماوراء کسی شے کا وجود نہیں۔ مذہب جن مافوق الفطرت ہستیوں اور طاقتوں کا ذکر کرتا ہے وہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہیں۔" لہٰذا مارکس کے نزدیک "سب سے سخت تنقید، مذہب کی تنقید ہے، اس لئے کہ مذہب انسانوں کے لئے افیون کا حکم رکھتا ہے۔" وہ کہتا ہے کہ

> مذہب، انسانی ذہن کی پیداوار ہے، انسان، مذہب کی پیداوار نہیں۔ مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے جو یا تو ابھی تک اپنے مقام انسانیت سے بے خبر ہے یا جس نے اس مقام کو پا کر پھر سے اسے کھو دیا ہے۔ مذہب، مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حالات کی روح ہے جن میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کے فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات اور دیگر تمام تصورات سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادی انسان کی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مارکس کے نزدیک، مذہب، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور اسی قسم کے دوسرے تصورات کا کوئی حقیقی وجود نہیں، تو پھر وہ کونسی قوت ہے جس کی بنا پر تاریخ میں جدلیاتی جنگ جاری ہے۔ ایک نظام اپنے عروج پر پہنچ کر کیوں ایک اور نظام پیدا کرتا ہے، جو پہلے نظام کو مٹا کر اس کی جگہ خود مسلط ہو جاتا ہے؟ یہ نظام استبدال و استخلاف کس قوتِ محرکہ کے ماتحت سرگرم عمل ہے؟

مارکس کہتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں زندگی کی اصل بنیاد اس دور کا معاشی نظام ہوتا ہے جس پر

مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی عمارت قائم ہوتی ہے۔ جس دور میں جس قسم کا معاشی نظام ہوگا، اس دور میں اسی قسم کا اخلاق و تمدن ہوگا۔ لہٰذا اصل شے، معاشی نظام ہے۔ تاریخ کے میدان میں کوئی جنگ تصورات (Ideas) کے اختلاف سے نہیں لڑی جاتی بلکہ معاشی نظام کے اختلاف سے لڑی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے اخلاقی اقدار (Moral Values) بھی معاشی نظام کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ایک معاشی نظام ایک وقت تک کارفرما رہتا ہے۔ پھر آفرینشِ دولت کے طریقے (Methods of Production) بدل جانے سے اس نظام کی بنیادیں مرتعش ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک جدید نظام ظہور پذیر ہو جاتا ہے اور اس جدید نظامِ معیشت (Economic System) کے ساتھ ہی سوسائٹی کی تمام اقدار (Values) بدل جاتی ہیں۔ کبھی معاشی نظام کی بنیاد غلامی پر تھی۔ اُس دور میں، اطاعت، فرمانبرداری، فروتنی، انکساری، خاکساری، "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال آگے کر دینا" اخلاقی اقدار تھیں۔ پھر اس کی جگہ جاگیرداری نظام نے لی تو شجاعت، غیرت، حمیت، فخر و تکبر نے اخلاقی اقدار کی جگہ لے لی۔ اب سرمایہ داری (Capitalism) کا دور دورہ ہے تو جھوٹ، فریب، مصلحت کوشی، نفع بینی، خود غرضی ہی وہ اقدار ہیں جن کا بازار میں چلن ہے۔ میکیاؤلی کی طرح، مارکس بھی یہی کہتا ہے کہ نیکی وہ ہے جو پیداوار کی فراوانی میں مدد دے اور برائی وہ جو اس کی وسعتوں کی راہ میں حائل ہو۔

پھر وہ یہ کہتا ہے کہ ایک معاشی نظام کے عروج کے وقت اس کے مختلف طبقات میں باہمی نفرت کھلی ہوئی مبارزت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تصادم اس نظام کی تخریب کا باعث اور ایک نظامِ جدید کی تخلیق کا موجب بنتا ہے۔ ساری تاریخ انہی طبقاتی تصادم (Class Struggles) کی آئینہ دار ہے۔ جس طرح کتے، ہڈی پر لڑتے ہیں اسی طرح انسان ہمیشہ روٹی کی خاطر لڑتا رہا ہے۔ اس کو Economic Interpretation of History "تاریخ کی اقتصادی تعبیر" قرار دیتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک نوعِ انسانی کی تمام تاریخ عبارت ہے فقط روٹی کی جنگ سے۔ چنانچہ وہ اشتمالی منشور (Communist Manifesto) کے پہلے صفحہ پر لکھتا ہے:۔

> انسان نے اس وقت تک جتنے معاشرے قائم کئے ہیں ان سب کی تاریخ، طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، امراء و جمہور، سرمایہ دار اور مزدور ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرِ پیکار رہے ہیں۔ یہ لڑائی صدیوں سے یونہی مسلسل جاری ہے۔ کبھی اس کی آگ دھیمی پڑ جاتی ہے اور مخفی طور پر اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور کبھی اس کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ پھر اس کا انجام یا تو یہ ہوتا ہے کہ ایک انقلاب پورے معاشرے کو بدل ڈالتا ہے یا پھر دونوں برسرِ پیکار طبقے مٹ جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشی نظام کی یہ جدلیت (تصادم و تزاحم) پیدا کیوں ہوتا ہے۔ کیوں ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام لے لیتا ہے! مارکس اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ چیز تاریخی اقتضاآت (Historical Necessities) میں سے ہے۔ یعنی اس تبدیلی کے لئے کوئی خاص مقصد محرک نہیں ہوتا۔ مادی کائنات کی ہر شے ایک اندھی فطرت کے تابع چل رہی ہے۔ اسی طرح تاریخ کے تقاضے بھی اندھے ہیں۔ انہی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ ایک معاشی نظام دوسرے سے ٹکرائے اور دوسرا نظام اس کی جگہ لے لے۔ چونکہ تاریخی وجوب (Necessities) صرف تبدیلی کا خواہاں ہے، اس لئے ضروری نہیں کہ نیا نظام، پہلے نظام سے بہرحال بہتر ہو۔ تاریخی وجوب صرف یہ چاہتا ہے کہ پہلا نظام بدل جائے اور اس کی جگہ ایک اور نظام لے لے۔ جب یہ تبدیلی ایک بلا مقصد قانونِ تاریخ کے ماتحت واقع ہوتی ہو تو ظاہر ہے کہ اس انقلاب میں حصہ لینے والے بھی کسی "کارِ خیر" میں ممد و معاون نہیں ہوتے بلکہ ایک "ہو کر رہنے والے واقعہ" کے جلد بروئے کار آجانے میں معاونت کرتے ہیں۔ اسی لئے مارکس کے نزدیک تاریخ کی بڑی بڑی ہستیوں کی عظمت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انھوں نے کسی ایسے انقلاب کے وقت اس جماعت کی قیادت کی جو نظامِ کہن کی جگہ نظامِ جدید کی تخلیق میں ممد و معاون تھی، خواہ یہ نظامِ جدید کیسا ہی کیوں نہ تھا۔

سلیم! تم نے دیکھا ہوگا کہ اس انقلاب میں انسان کس طرح، تاریخی وجوب کے ہاتھوں ایک بے جان آلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک بات تمہارے لئے یقیناً وجہِ ہزار استعجاب ہوگی۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ مغرب نے خدا کا انکار اس لئے کیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے سے اسے خدا کے احکام کی اطاعت کرنی پڑتی تھی جس سے انسانی ارادہ و اختیار سلب ہو جاتا تھا۔ لہٰذا دہریت یا مادہ پرستی، انسانی اختیار و ارادہ کو حدود فراموش قرار دیتی ہے۔ اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا کے انکار سے انسانی عظمت کی بلندی ہوتی ہے کیونکہ اس طرح سے وہ اپنی دنیا کا آپ مالک و مختار قرار پاتا ہے۔ لیکن تم حیران ہوگے کہ یورپ کی مادہ پرستی انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ کی بجائے مجبورِ محض بنا دیتی ہے۔ بظاہر یہ چیز متضاد سی نظر آئیگی لیکن حقیقت بالکل یہی ہے۔ ڈارون کے نظریہ کی رُو سے کائنات میں ارتقا کا سلسلہ جاری ہے اور انسان اس عملِ ارتقار کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ انسانی عقل، شعور، فکر سب اسی حیاتیاتی ارتقار (Biological Evolution) کا نتیجہ ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں، اس لئے انسان ارتقائی طور پر مجبور ہے۔ یعنی انسان اسی عمل کی اگلی کڑی ہے جس کی پچھلی کڑی حیوانات کی زندگی ہے۔ لہٰذا انسان اور حیوان میں فرق صرف درجہ (Degree) کا ہے، نوعیت (Quality) کا نہیں۔ یہ حیاتیاتی جبریت (Biological Determinism) ہے، قدریت نہیں ہے۔ مارکس آیا تو اس نے کہا کہ

انسانی اقدار اس کے خارجی ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں اور خارجی ماحول ہوتا ہے تاریخی وجوب کا نتیجہ۔ انسان کو نہ تاریخی وجوب کے بدلنے پر اختیار ہے، نہ خارجی ماحول کی تبدیلی پر قدرت۔ لہٰذا اس کے نظریہ کی رو سے بھی انسان مجبور محض ہے۔ دونوں میں یہی فکری مماثلت تھی جس کی وجہ سے مارکس نے ڈارون سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی ایک کتاب کا انتساب قبول کرلے۔ ڈارون جبریت حیاتیاتی (Biological Determinism) کا امام اور مارکس (Economic Determinism) کا قائل۔ اسی طرح نفسیات کی دنیا میں آئیے تو ڈاکٹر واٹسن کا نظریہ (Behaviourism) اس کے تمام اختیار و ارادہ کو چند غدودوں کی ساخت اور ان کے عمل تحریک (Secretion) کا پابند بنا دیتا ہے اور ینگ اور آڈلر سے پوچھئے تو وہ اسے یکسر ماحول و وراثت کا رہین منت۔ خود ان کے امام فرائڈ کو لیجئے تو وہ شعور کو غیر شعوری دنیا کی زنجیروں سے بندھا ہوا بتاتا ہے۔ تم نے دیکھا! سلیم! مغرب کی مادیت کس طرح انسان کو صاحب اختیار و ارادہ کے بجائے مجبور محض بنا دیتی ہے۔ چونکہ اخلاق کی ساری عمارت انسانی ارادہ پر استوار ہوتی ہے، اور مغرب کی مادیت اس سے اس کا ارادہ سلب کرلیتی ہے اس لئے وہاں اخلاق کا کوئی ضابطہ باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس کے فلسفہ میں بھی اخلاق کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ لہٰذا جب اشتراکی نظام کے حامل، مزدوروں کی حمایت میں علم بغاوت بلند کرتے ہیں تو یہ کسی اخلاقی جذبہ ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتا کیونکہ اخلاقی اقدار کا ان کے ہاں تصور ہی نہیں بلکہ یہ انقلاب ایک تاریخی تقاضا کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے اور یہ لوگ اس تقاضا کا ساتھ دیتے ہیں۔

سلیم! تم کسی اشتراکی سے پوچھو کہ غریبوں اور مزدوروں کی حمایت کیوں کرنی چاہئے؟ وہ لامحالہ یہی کہے گا کہ یہ عقل کا تقاضا ہے۔ اس سے پوچھئے کہ کس کی عقل کا؟ سرمایہ داروں کی عقل کا تقاضا تو اس کے خلاف ہے! لہٰذا یہ معاملہ عقل سے تو طے نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ کہے کہ یہ انسانی فرض ہے تو پوچھئے کہ انسان پر یہ فریضہ کس نے عائد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو عائد کرنے والی قوت، مزدوروں اور سرمایہ داروں یعنی انسانوں سے ماوراء ہونی چاہئے۔ اشتراکی فلسفہ کسی ایسی قوت کا قائل ہی نہیں۔ لے دیکے وہ یہ کہیگا کہ یہ تاریخی اقتضاء ہے۔ تو یہ سوائے اعتراف عجز کے اور کچھ نہیں۔ یعنی جب "ایسا کیوں ہونا چاہئے" کا کوئی جواب نہیں پاتے تو اس کے لئے کوئی مبہم سا نام رکھ لیتے ہیں اور مطمئن ہوجاتے ہیں کہ ہم نے وجہ دریافت کرلی ہے۔ ڈارون کی "اندھی فطرت" اور مارکس کا "تاریخی وجوب" سب نام ہیں۔ وہی نام جن کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ اسماء سمیتموھا انتم وآباؤکم (یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔) کتنی بڑی حقیقت ہے جسے سلیم! قرآن نے چند الفاظ میں بیان کردیا ہے۔

سلیم! کہیں تم اکتا تو نہیں گئے! ہر چند میں نے کوشش کی ہے کہ بات فلسفیانہ نہج و اسلوب سے ہٹ کر عام انداز میں کی جائے لیکن فلسفہ کی بوست اپنا اثر بہرحال قائم رکھتی ہے۔ بات چونکہ ذرا پھیل گئی ہے اس لئے قطع شدہ منزل پر نگہِ بازگشت ڈال لینا ضروری ہے۔ مارکس کے فلسفہ کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) خدا کا تصور ذہن انسانی کا پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا مذہب ایک بہت بڑا فریب ہے۔

(۲) انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ معاشی ہے۔

(۳) جب ایک معاشی نظام اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک دوسرا نظام پیدا ہو جاتا ہے جو اس نظام کہن کی ضد ہوتا ہے۔

(۴) ہر معاشی نظام میں طبقات کی نزاع لاینفک ہوتی ہے۔ ساری تاریخ انہی طبقاتی نزاعات کی داستان ہے۔

(۵) معاشی نظام کے پیدا کردہ ماحول سے انسانی ذہن متاثر ہوتا ہے اس لئے اس کے افکار و تصورات اور اخلاق و عقائد سب اسی ماحول کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔

(۶) چونکہ معاشی نظام اور اس کے ساختہ ساختہ خارجی ماحول بدلنے والی چیزیں ہیں اس لئے افکار و تصورات اور اخلاق و عقائد کی دنیا میں کوئی مستقل قدر نہیں۔ نیکی وہ جو دولت کی پیداوار میں فراوانی کا موجب ہو اور برائی وہ جو اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔

(۷) یہ سب سلسلۂ تغیر و تبدل ایک مبہم نظریہ کے ماتحت واقع ہوتا ہے جسے تاریخی وجوب کہتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی (خدا کے بعد) حکومت کا وجود ہے۔ اس لئے کمیونزم ایک ایسی سوسائٹی کی تخلیق چاہتا ہے جس میں حکومت کا وجود نہ ہو۔ اسے (Anarchy) یا نوضویت کہتے ہیں۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک عبوری دور سے بھی گزرنا پڑتا ہے جس میں مزدوروں کی آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کی حکومت ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں لینن نے انقلابِ روس کے بعد وہاں آمریت قائم کی۔ لینن ۱۹۲۴ء میں مرگیا اور اس کی جگہ اب سٹیلن روس کا ڈکٹیٹر ہے۔ مارکس، منشورِ اشتراکیت (Communist Manifesto) میں لکھتا ہے کہ

> سرمایہ داروں نے جو ظلم و تشدد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت کا برسرِ اقتدار آ کر عالمگیر یکسانیت و مساوات پیدا کرنا ہے ۔ ۔ ۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ دنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی اور انفرادی حقوق کے

خیال کو فنا کر دیا جائے اور اس طرح جب مزدوروں کی جماعت کو تسلط حاصل ہو جائے تو تدریجاً سرمایہ داروں کے تمام املاک و خزائن پر قبضہ کر لیا جائے۔ . . . یہ مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ موجودہ نظام معاشرت کو مسلح قوت کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔

لینن لکھتا ہے کہ

سرمایہ داری کی غیر مرئی قوتوں نے ذہن انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کر دی ہے جس سے ایک حاکم اعلیٰ کے تخیل کی بنیاد پڑی۔ اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ سو جب تک خدا کا تخیل ذہن انسانی سے فنا نہ کر دیا جائے یہ لعنت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔

ایک اور جگہ یہ لکھتا ہے۔

"مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے" اس لئے مارکس ازم کی رو سے دنیا کے تمام مذاہب اور کلیسا سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں جن کے توسط سے مزدور جماعت کے حقوق کو پامال کیا جاتا ہے اور انھیں فریب دیا جاتا ہے۔ لہٰذا نفس مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لئے ضروری ہے تاکہ دنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے۔

اخلاق کے متعلق لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے،

ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہئے ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے، عین اخلاق ہے۔ اشتراکیین کا اخلاق و شریعت تو صرف اعتقاد ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت و سطوت کا استحکام و استبقاء کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ معاندین کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔

یہ فریب دہی اور دروغ بافی دشمنوں کے خلاف ہی نہیں، بلکہ عند الضرورت خود اپنی جماعت کے افراد سے بھی انہی حربوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ (Gollancz) اپنی کتاب Our Threatened Values) میں لکھتا ہے کہ (Dr. G. Luckus) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی جماعت کے لیڈروں کیلئے

یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب و فریب دہی سے کام لیں؟ تو اس کے جواب میں اس نے کہا کہ

> اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عندالضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے "انقلاب" نے مطالبہ کیا تھا۔

اب رہا طریقِ کار، سو اس کے متعلق لینن اپنی کتاب (State and Revolution) میں لکھتا ہے کہ

> سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسرِ اقتدار آ جانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ، انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے، لینن لکھتا ہے!

> انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و تسلط: قوت و استیلاء، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھار اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی کراتا ہے۔

ڈکٹیٹرشپ کے متعلق (Stalin) اپنی کتاب (Leninism) میں خود لینن کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ

> ڈکٹیٹر ایسی مختارِ عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود قاطبۃً قوتوں کے ہجوم پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سن لیں اور خوب غور سے سن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں "قوت"؛ غیر محدود اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ سروکار نہ ہو۔

یعنی سلیم! یہ اقتباسات اس لئے دیئے ہیں تاکہ تم از خود دیکھ سکو کہ مارکس ازم کے ماتحت جس قسم کا نظامِ معاشرت قائم ہو گا اس کے عناصرِ ترکیبی کیا ہوں گے، اس کے مقاصد کیا ہوں گے اور طریقِ کار کیا۔ خدا کی نفی، ضوابطِ اخلاق کی نفی اور حکومت کی نفی۔ بقول علامہ اقبالؒ

> کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لا سلاطین، لا کلیسا، لا اِلٰہ

حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم، سرمایہ داری کے نظام کے خلاف ایک شدید ردِ عمل ہے، جس کے پیشِ نظر صرف تخریب ہی تخریب ہے، تعمیر کا پہلو اس میں کچھ نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم محض منفیانہ فلسفۂ حیات سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ زندگی کا تقاضا مثبت فلسفہ ہے۔ اگر تخریب کسی تعمیر کا پیش خیمہ نہیں تو اس تخریب سے کچھ فائدہ نہیں۔

لا و الّا ساز و برگِ امتاں نفی بے اثبات مرگِ امتاں

یہ ہے سلیم! مختصر الفاظ میں کمیونزم لیعنی وہ فلسفۂ زندگی جو ہیگل کے فلسفۂ اضداد سے شروع ہوا۔ پھر مارکس نے اس کی بنیاد خالص مادیت پر رکھی اور روس میں لینن اور سٹالن کے ہاتھوں اس نے ایک عملی نظام کی صورت اختیار کی۔ اب اس کے اجزائے ترکیبی یوں قرار پائے کہ

(۱) خدا کا تصور سرمایہ داری کی قوتوں کا پیدا کردہ ہے اس لئے سب سے پہلے ذہن انسانی کو اس ڈر سے نجات دلانی چاہیے۔

(۲) ضوابطِ اخلاق، نظامِ سرمایہ داری کے قائم کردہ ہیں اس لئے انہیں توڑنا ضروری ہے۔

(۳) انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ معاش کا ہے۔ افکار و تصورات اور اخلاق و شرائع سب اس کے تابع رہنے چاہئیں۔

(۴) جب ایک معاشی نظام اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک دوسرا نظام پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔

(۵) یہ سلسلۂ تغیر و تبدل، تاریخی اقتضار کے ماتحت از خود رونما ہوتا رہتا ہے۔

(۶) جماعتی نزاع ہر معاشی نظام میں لاینفک ہوتی ہے اور حکومت ان افراد پر مشتمل جن کے ذاتی مفاد نظامِ سرمایہ داری سے منسلک ہوتے ہیں۔

(۷) لہٰذا نظامِ جدید میں جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے گا اور خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ حکومت کے وجود کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔

یہ تو ہی کمیونزم۔ اب اس فلسفۂ زندگی کے مقابلہ میں اسلام بھی ایک فلسفۂ زندگی پیش کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کمیونزم اور اسلام میں کیا فرق ہے، اسلام کے فلسفۂ زندگی کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ اسے ایک مرتبہ پھر سمجھ لو سلیم! کہ میں اس وقت صرف فلسفۂ زندگی سے بحث کر رہا ہوں، اسلام کے احکام و ارکان سے بحث نہیں کر رہا۔ اس فلسفۂ زندگی کے متعلق میں بہت کچھ تمہیں لکھ چکا ہوں لیکن معلوم نہیں کہ وہ مربوط طریق سے تمہارے ذہن میں مستحضر ہے یا نہیں۔ اس لئے مختصر الفاظ میں اس فلسفۂ زندگی کی اہم شقوں کو دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ذرا غور سے سنو کہ یہ باتیں بڑی اہم ہیں اور جب تک تم انہیں سینے کی آنکھوں سے نہیں پڑھو گے اور دل کے کانوں سے نہیں سنو گے، اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اسلام کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ

(۱) کائنات کی پیدا کرنے والی اور اسے چلانے والی ایک اعلیٰ ہستی ہے جسے ہم خدا کہہ کر پکارتے ہیں۔

(۲) کسی شے کو مخلوق اسوقت کہتے ہیں جب وہ محسوس و مشہود پیکر میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل اس کا تعلق عالمِ امر سے ہوتا ہے۔ لہٰذا مادہ، عالمِ امر ہی کی ایک محسوس شکل ہے۔
(Materialisation of Spirit)

(۳) مادہ میں جو عالمِ امر کا مظہر (Manifestation) ہے، ہر آن تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن عالمِ امر تغیرات سے ماوراء ہے۔

(۴) عالمِ امر سے جو کچھ متعلق ہوگا وہی مستقل ہوگا۔ مستقل کو حق کہتے ہیں، یعنی جو اپنی جگہ پر اٹل ہو۔ خدا حق ہے اور اس کا امر بھی حق۔

(۵) خدا نے کائنات کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے، لہٰذا کائنات کے تغیرات و حوادث یونہی اتفاقی اور ہنگامی طور پر رونما نہیں ہوتے بلکہ ایک ہدایت (Direction) کے ماتحت ہوتے ہیں۔

(۶) یہ ہدایت، عالمِ امر ہی سے مل سکتی ہے کیونکہ وہی تغیرات سے ماوراء ہے، اس ہدایت کے ماتحت سلسلہ کائنات اپنے مقصد متعینہ کی طرف رواں دواں چلے جا رہا ہے۔ اس لئے کائنات کی "تخلیق بالحق" ہوئی ہے۔

(۷) کائنات کی باقی ہر چیز بلا چون و چرا، اس ہدایت کے مطابق سرگرمِ عمل ہے، لیکن انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔

(۸) یہ اختیار و ارادہ مادی ارتقاء کا نتیجہ نہیں کیونکہ مادہ مجبور ہے اور جو خود مجبور ہو وہ اختیار پیدا نہیں کر سکتا۔

(۹) یہ اختیار و ارادہ اور حیات و شعور شئونِ الٰہیہ کی ایک شان (Aspect) ہے جسے انسان کے مادی پیکر میں پھونک دیا گیا ہے۔ یہ انسانی انا (Self) ہے۔

(۱۰) یہ انا تمام انسانوں میں قدرِ مشترک ہے۔ اسی اشتراک سے انسانی اشتراکیت کی بنیاد پڑتی ہے، یعنی مساواتِ انسانی ۔ آدمیت احترامِ آدمی۔

(۱۱) انسان کو بھی اسی عالمِ امر سے ہدایت (Direction) ملتی ہے جہاں سے کائنات کی دیگر اشیاء کو ہدایت مل رہی ہے۔ اس ہدایت کو وحی کہا جاتا ہے۔

(۱۲) وحی، مستقل اقدار (Permanent Values) متعین کرتی ہے اور انہی اقدار کا نام اصولِ فطرت یا احکامِ الٰہیہ ہے۔

(۱۳) انسان سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے اور دنیا کے ہر گوشے میں ان مستقل اقدار کے

مطابق کام کرے۔

(۱۴) انسانی فکر و عمل جس قدر ان مستقل اقدار سے ہم آہنگی اختیار کرتا جائے گا اسی قدر اس کے اندر "شانِ استقلال" پیدا ہوتی جائے گی (اسے تعمیرِ سیرت یا استحکامِ خودی کہا جاتا ہے) اور چونکہ استقلال (Permanency) صرف حق کا خاصہ ہے اس لئے اس طرح یہ حق سے قریب اور قریب تر ہوتا چلا جائے گا۔ (اسے قربِ خداوندی، یا صبغۃ اللہ ـــ خدا کے رنگ میں رنگے جانا، کہتے ہیں)۔

(۱۵) کائنات کی کوئی شے انفرادی طور پر کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف عوامل میں باہمی تعاون و تناصر ہو۔ اسی ربطِ باہمی سے تمام سلسلۂ کائنات قائم ہے۔

(۱۶) یہی اصول انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ اس لئے اس مقصدِ عظیم کے لئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، انسانوں کو باہمی تعاون و تناصر سے کام لینا ہو گا (اسے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کہا گیا ہے)۔ اس ربطِ باہمی سے سوسائٹی (جماعت) کا وجود قائم ہوتا ہے۔ ایک ربط صرف (Co-operative System) کا ہوتا ہے۔ یہ اتحاد ہے۔ اسلام اس سے آگے لے جاتا ہے اور اتحاد کی بجائے ائتلاف کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی ایسا ربط جیسے درخت کے بیج، مٹی، پانی اور ہوا کا ربط ہوتا ہے کہ ان سب کے ائتلاف سے ہر ایک کے جوہرِ پوشیدہ کی نشوونما ہوتی ہے اور ان کا نتیجہ ایک سرسبز و شاداب درخت کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے۔

(۱۷) اس جماعت کا کام یہ ہے کہ پہلے اپنی زندگی کو مستقل اقدار کے تابع رکھے اور پھر ان مستقل اقدار کو عالمگیر حیثیت سے تمام نوعِ انسانی تک پھیلائے۔ (اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں)۔

(۱۸) چونکہ دنیا میں ایسے لوگ (جماعتیں اور قومیں) موجود ہیں جو مستقل اقدار کے نفاذ پذیر ہو جانے میں اپنے ان ذاتی منافع و مصالح کا نقصان محسوس کرتے ہیں جو انھوں نے غاصبانہ طریق (یعنی اصولِ فطرت کے خلاف) حاصل کر رکھے ہوئے ہیں، اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۱۹) اس مخالفت کی روک تھام قوت کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا اس جماعت کے لئے جس کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، قوت کا ہونا لاینفک ہے۔ اس نظام یا قوت کو نظامِ حکومت کہتے ہیں۔

(۲۰) اس نظام، اور انسانی خود غرضیوں پر مبنی غاصبانہ نظام ہائے معاشرت میں تصادم ضروری ہے۔ اسی کا نام خیر و شر کی جنگ ہے، حق و باطل کی لڑائی ہے، تاریخ اس تصادم کی داستان کا

نام ہے۔ نمرود و براہیمؑ، فرعون و موسیٰؑ، بولہب و محمدؐ اسی تصادم کے مظاہر ہیں۔

(۲۱) مستقل اقدار کے تابع قائم شدہ نظامِ زندگی کا فطری نتیجہ ربوبیت اور عدل ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں آغاز سے اختتام تک کی تمام منازل میں سامانِ پرورش کی فراہمی۔ اور عدل سے مفہوم یہ ہے، کہ ہر فرد کی فطری صلاحیتوں کے مکمل طور پر ابھرنے اور نشو و نما حاصل کرنے کے مواقع مہیا کرنا۔

(۲۲) اس معاشرہ میں عدل کے ساتھ احسان بھی ہوتا ہے۔ احسان، حسن سے ہے اور حسن کے متعلق تم جانتے ہی ہو کہ یہ توازن (Proportion) کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا احسان کا مفہوم ہے معاشرہ میں توازن کا قیام۔ اگر کسی ایک فرد یا گروہ میں ہنگامی حوادث سے کسی چیز میں کمی آ گئی ہے اور دوسرے میں زیادتی، تو باہمی ترتیب (Adjustment) سے اس کمی کا اس طرح پورا کرنا کہ نظامِ معاشرہ میں توازن قائم ہو جائے۔ توازن کے بگڑنے کا نام فساد ہے۔ اور قرآن، فساد کو طاغوتی نظام کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ڈارون کے نظریہ کی رو سے دنیا میں جو (The Fittest) نہیں اسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ لیکن اس نظامِ عدل و احسان میں جو (The Fittest) نہیں اسے (The Fittest) بنایا جائے گا۔ اسی لئے اس نظام کا اصول بقائے انفع ہے۔ یعنی باقی وہ رہے گا جو نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔ (سورۂ رعد)

(۲۳) اور اس نظام میں یہ کچھ یونہی "تاریخی وجوب" کے مبہم مفروضہ کے ماتحت میکانکی طور پر رونما نہیں ہوتا بلکہ ہر فرد کے دل کے ارادوں، ذہن کی کاوشوں اور بازو کی قوتوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس فرد کا ایمان ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہتی۔ اور ظہورِ نتائج سانس کی آمد و رفت ہی کا پابند نہیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو موجودہ مادی اجزا کے پریشان ہو جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اس کا ہر وہ عمل جو مستقل اقدار کے مطابق ہے (اسے مشیت سے ہم آہنگی اور رضائے الٰہیہ کا حصول کہئے) اس کے شرفِ انسانیت کی تکمیل کا موجب ہے (اور یہ جنت کا مقام ہے) اور ہر وہ کام جو ان اقدار کے خلاف ہے اس سے مقامِ انسانیت چھین لینے کا باعث (یہ جہنم کی زندگی ہے)۔

میں نے سلیم! کوشش کی ہے کہ نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں اسلام کا فلسفۂ حیات تمہیں سمجھا سکوں۔ خدا کرے کہ تم نے اس سلسلۃ الذہب کی ہر کڑی کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا ہو، (ذہن نشین ہی نہیں بلکہ دل نشین) اگر کسی شق میں کوئی اشتباہ یا الجھاؤ ہو تو مجھ سے پھر پوچھ لینا۔ بہر حال یہ ہے اسلام کی رو سے فلسفۂ زندگی۔ اب اس فلسفۂ زندگی کو اور اس فلسفۂ حیات کو جو کمیونزم پیش کرتی ہے، آمنے سامنے رکھو اور پھر خود ہی فیصلہ کر لو کہ

کیا یہ دونوں ایک ہی ہیں؟ تم واضح طور پر دیکھ لوگے کہ نہ صرف یہ کہ یہ دونوں ایک نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں کمیونزم کا بھی قائل ہو اور اسلامی فلسفۂ زندگی کا بھی۔

میں نے تمہارے خط کے اس حصہ کو بڑے غور سے پڑھا ہے جس میں تم نے لکھا ہے کہ

> جب آپ لوگ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں تو اس سے موجودہ نظام سرمایہ داری کو بڑی تقویت مل جاتی ہے اور وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کمیونزم اسلام کے خلاف ہے لہذا ان کی روش زندگی اسلام کے مطابق۔

میں اس خطرہ سے آگاہ ہوں۔ اس لئے اس حقیقت کو بھی واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح اسلام کا فلسفۂ زندگی اور نظام حیات، کمیونزم کے خلاف ہے اسی طرح وہ ہمارے موجودہ نظام زندگی کے بھی خلاف ہے جو ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار اور عجمی تصورات کی یادگار ہے۔ جہاں تک سرمایہ داری نظام کا تعلق ہے، اسلامی نظام بھی اس کا کمیونزم سے کم دشمن نہیں۔ اسلامی نظام کیا ہے؟

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ

کس نباشد در جہاں محتاج کس — نکتۂ شرع مبیں این است و بس

میرے پیارے سلیم! اس وقت یہ ممکن نہیں کہ میں اسلام کے معاشی نظام کو وضاحت سے تمہارے سامنے رکھ دوں۔ اس وقت میں صرف اتنا بتا سکوں گا کہ اسلام نظامِ سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن ہے اور اپنے نظام کے اندر آنے والے ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل۔ سرمایہ داری کی لعنت کی ابتدا زمینداری سے ہوتی ہے یعنی ایک شخص دس ہزار ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ غریب کاشتکار سال بھر محنت کرتا ہے اور اس کی محنت کا ماحصل زمیندار کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ جہاں تک سلیم! میری قرآنی بصیرت میری رہنمائی کرتی ہے میں دیکھتا ہوں کہ قرآن، زمین پر انفرادی ملکیت کی اجازت نہیں دیتا۔ زمین کو وہ ملتِ اسلامیہ (نظامِ حکومتِ قرآنیہ) کی ملکیت قرار دیتا ہے جو اسے ہر شخص کی ضرورت کے مطابق تقسیم کرتی رہتی ہے۔ زمین ہی نہیں، بلکہ رزق کے جسقدر سرچشمے قدرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، وہ ان سب کو ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے۔ سورۂ حٰمٓ سجدہ میں دیکھو جہاں ارشاد ہے کہ

> اللہ نے زمین کی سطح پر پہاڑ پیدا کئے اور اس میں (ایسی چیزیں پیدا کیں جو موجب) برکات ہیں۔ اور اس میں چار فصلوں میں خوراک کے سامان کا اندازہ متعین کیا۔ (ان سب کے دروازے) ہر ضرورتمند کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔

قرآنی احکام کے متعلق میں کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ وہ اصول بیان کرتا ہے جن کی جزئیات ہر دور میں اسپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق متعین کی جا سکتی ہیں۔ ہمارا زمانہ صنعت و حرفت (Industries) کا ہے۔ اس لئے جو اصول زمینداری کے متعلق ہے وہی کارخانوں پر بھی نافذ ہوگا۔ اصل شے تو دولت کا جمع کرنا ہے جس کے متعلق ارشاد ہے کہ

> کس قدر بدبختی ہے اس کے لئے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے (کہ اس میں کسقدر اضافہ ہوا) کیا یہ سمجھتا ہے کہ یہ دولت اس کے پاس ابدالآباد تک رہے گی؟ کبھی نہیں۔ بلکہ یہ تو اسے ایک ایسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے جہنم کی طرف لے جائیگی جس کی آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ (۱۰۴/۲-۳)

دوسری جگہ ہے کہ

> جو لوگ چاندی اور سونے کے دفینے جمع کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں ایک دردناک عذاب کی بشارت دیجئے۔ جس دن ان سکوں کو آگ میں تپایا جائے گا (اور کہا جائے گا کہ ہاں) یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے روک کے رکھا تھا۔ سو اب اس کا مزہ چکھو (۹/۳۴-۳۵)

اس الکناز سے صرف یہ مفہوم نہیں کہ روپوں کو گھروں کے اندر دفینے کی شکل میں نہ رکھا جائے۔ بلکہ یہ کہ دولت کو ایسے نہ رکھا جائے کہ وہ پیداوار کا ذریعہ نہ بن سکے۔ اور دولت کی پیداوار سے مراد روپے پر منافع نہیں۔ کیونکہ اسے ربوٰ کہا جاتا ہے۔ اور ربوٰ حرام ہے۔ ربوٰ میں ہر وہ آمدنی آجاتی ہے جس میں کسی کی محنت کو دخل نہ ہو۔ اب دیکھئے گردش، سو اس کے متعلق واضح طور پر قرار دیا کہ دولت کی گردش اس طریق پر نہیں ہونی چاہئے کہ وہ امراء کے طبقہ میں ہی پھرتی رہے۔ (۵۹/۷)

یہ تو رہا دولت کی گردش کا اصول۔ اب اس سے آگے چلئے۔ اصول یہ ہے کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ (انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کے لئے وہ محنت کرے) اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) کوئی شخص بلا محنت کچھ نہیں لے سکتا۔ (جو کچھ بلا محنت حاصل کریگا وہ ربوٰ میں داخل ہو جائے گا۔)

(۲) کوئی دوسرے کی محنت کا ماحصل نہیں لے سکتا (یہ غصب ہے)۔ اور

(۳) کسی سے کسی کی محنت کا حق چھینا نہیں جا سکتا۔

شق سوم کو غور سے دیکھئے۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں مختلف انسانوں کی سعی و کاوش کی صلاحیتیں (اور اکتسابی قوتیں)

مختلف ہوتی ہیں۔ لہذا ان کی محنت کا ماحصل بھی ایک جیسا نہیں ہوگا۔ قرآن اس اختلاف مدارج کا قائل ہے؛ اور جب وہ ہر فرد کو اس کی سعی و عمل کے ماحصل کا حقدار قرار دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ مختلف افراد کی آمدنی (محنت کا ماحصل) بھی مختلف ہوگی۔ قرآن انہیں اس سے محروم نہیں کرتا۔ لیکن وہ انہیں اس کا مالک بھی قرار نہیں دیتا۔ فقط امین قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام میں ہر فرد کے اموال (و نفوس) کا مالک خدا ہے (یعنی وہ نظام جو احکام خداوندی کی تنفیذ کا ذمہ دار ہے) اور افراد اس کے امین (۹/۱۱۱) وہ امین اس امانت کو اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ لیکن جس طرح قرآن دیگر امور میں حدبندی کر دیتا ہے اور انسانی آزادی انہی حدود کے اندر محصور ہوتی ہے اسی طرح وہ تعین ضروریات کو بھی بلا محدود نہیں رکھتا۔ وہ اسراف (ضرورت سے زیادہ خرچ) اور تبذیر (بلا ضرورت خرچ) کو ممنوع قرار دیتا ہے (اور ظاہر ہے کہ اس کا تعین بھی یہی نظام کریگا۔ سورۂ ہود میں دیکھو سلیم! قوم حضرت شعیبؑ نے یہی اعتراض کیا تھا جب حضرت شعیبؑ سے کہا تھا کہ کیا تمہاری نماز (یعنی نظام الٰہیہ) اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال میں جس طرح جی چاہے تصرف کر سکیں؟ (۱۱/۸۷) [اس سے سلیم! تم اس حقیقت کو بھی دیکھ سکو گے کہ قرآن کے نزدیک "صلوٰۃ" سے کیا مفہوم ہے۔ صلوٰۃ خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق کا نام نہیں بلکہ اس نظام کا نام ہے جو احکام الٰہیہ کی تنفیذ کے لئے ایک ہیئت اجتماعیہ (جماعت) کی شکل میں متشکل ہوتا ہے۔] پھر اس کے بعد بھی اگر اس کے پاس کچھ بچ رہے تو، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وہ اس کے پاس بطور امانت محفوظ رہتا ہے۔ یہ نظام عند الضرورت اس میں سے بطور ٹیکس وصول کر سکتا ہے (اور ٹیکس یعنی زکوٰۃ، کی آخری حد یہ ہے کہ تمام کا تمام فاضلہ مال لے لیا جائے)۔ اب سلیم! سوچو کہ اگر کسی کے پاس کچھ روپیہ محفوظ بھی رہا تو اس نظام میں وہ اس کے کس مصرف کا ہوگا! آج ہم روپے کو اس لئے جمع کرتے اور اس میں اضافہ کرتے رہتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو محفوظ نہیں پاتے۔ یعنی ہمیں ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ نہ معلوم کل کو کونسی ناگہانی آفت آجائے اور ہم بھوکوں مرنے لگ جائیں، یا ہماری موت بے وقت آجائے تو ہماری اولاد بھیک مانگتی پھرے۔ لیکن یہ عدم تحفظ "(Insecurity)" کی زندگی تو موجودہ نظام سرمایہ داری کی لعنت ہے۔ قرآنی نظام میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنی مملکت میں ہر چلنے والے کی تمام ضروریات زندگی کی کفیل ہو" (۱۱/۶)۔ وہ نظام

(۱) ہر کام کرنے کے قابل فرد کے لئے کام مہیا کرے گا۔

(۲) اس کی محنت کا ماحصل اگر اس کی ضروریات سے کم ہے تو اس کی ضروریات کی کفالت کیلئے اس میں اضافہ کرے گا۔

(۳) جو کام کر سکنے کے قابل نہیں، یا لاوارث ہیں، ان سب کی ضروریاتِ زندگی کا ذمہ دار ہوگا۔

(۴) "ضروریات" کا تعین اس طرح ہوگا کہ ہر فرد کو اس کی فطری صلاحیتوں کے نشوونما کے پورے پورے مواقع مہیا کئے جائیں اور اس میں نسب اور وراثت کا کوئی اثر و دخل نہ ہو۔

(۵) ہر شخص کو اس کی محنت کا ماحصل ملے گا۔ روپے کی آمدنی (Return) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، یعنی یہ نہیں ہوگا کہ ایک شخص صرف روپیہ لگا INVEST کر کے بلا محنت اس کی آمدنی حاصل کرے۔

(۶) ذرائع پیداوار (زمینوں، کارخانوں وغیرہ) کی ملکیت، امت کی ہوگی، اور ان کا ماحصل ہر صاحبِ ضرورت کے لئے یکساں طور پر کھلا۔

(۷) جب زمین صرف حصولِ پیداوار کے لئے دی جائے گی (اور اسی کو جو اس میں سے خود محنت کر کے پیدا کرے) تو زمین پر جائدادیں کھڑی کر کے ان کی آمدنی کھانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ حکومت ہر فرد یا خاندان کو اس کی ضرورت کے مطابق سکونتی مکان مہیا کرے گی۔

یہ ہیں سلیم! موٹے موٹے اصول جن کی روشنی میں ہم اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق، ایک واضح معاشی نظام وضع کر سکتے ہیں۔ اس نظام کی تمام جزئیات میرے پیشِ نظر ہیں۔ لیکن ان کے بیان کرنے کی نہ یہاں گنجائش ہے نہ ضرورت۔ اور پھر اس اصلِ عظیم کو کبھی نہ بھولئے کہ یہ معاشی نظام اسلامی سوسائٹی کے ہمہ گیر نظام کا ایک ٹکڑہ ہے۔ وہ ہمہ گیر نظام انسان کو تمام تر اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے اس لئے اس معاشی نظام کو بھی اس ہمہ گیر نظام سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کے برعکس، کمیونزم کے نزدیک انسانی زندگی کا سارا مسئلہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ لیکن اس سے تو تم بھی متفق ہو گے اسلیم! کہ انسانی زندگی کا مسئلہ صرف روٹی کا نہیں۔ یہ تو انسانی زندگی کی بڑی توہین ہے کہ اسے محض روٹی کا مسئلہ قرار دیدیا جائے۔ یہ تو حیوانی زندگی ہوگی نہ کہ انسانی۔ یا انسان کے اس قدیم زمانہ کی زندگی جب اس کی زندگی ہنوز حیوانی زندگی سے متمیز نہیں ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کو محض مادہ کی تخلیق قرار دیدیا جائے تو پھر زندگی کا مفہوم خورد و نوش کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ اس لئے اگر مارکس کی نگاہ اس سے آگے نہ جا سکی تو اس کا قصور نہیں۔ لیکن اسلام، جو انسان کو تمام کائنات سے بلند و بالا قرار دیتا ہے، وہ اس کی زندگی کو محض آب و گِل کی چار دیواری میں کس طرح محبوس کر سکتا ہے! سچ پوچھو تو روٹی کے مسئلہ کا جو حل کمیونزم پیش کرتا ہے وہ جیل خانہ میں پورے طور پر موجود ہوتا ہے۔ وہاں ہر قیدی کو وہ کام دیدیا جاتا ہے جو اس کے لئے داروغہ مقرر کرے اور پھر تمام قیدیوں کو یکساں طور پر روٹی دیدی جاتی ہے۔

اس مقام پر تم، سلیم! کہدو گے کہ سوسائٹی میں ایسے حالات بھی تو پیدا ہو جایا کرتے ہیں کہ لوگ محض بھوک سے تنگ آ کر جیل خانہ چلے جاتے ہیں کہ وہاں کام لیا جائے گا تو ساتھ روٹی تو مل جائے گی۔

یہ درست ہے۔ اور کمیونزم پھیلتی ہی وہاں ہے جہاں نظامِ معاشرت ایسا ہو جائے کہ کام کرنیوالوں کو بھی ان کی کم از کم ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے کے لئے پیسہ نہ مل سکے۔ جب کسی معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو پھر وہاں کمیونزم کو کون روک سکتا ہے! لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے! غیر فطری نظام ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں انسان محض روٹی کی خاطر سب کچھ قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور کمیونزم اس کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ لیکن سلیم! "کمیونزم" خود ایک غیر فطری فلسفۂ زندگی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک غیر فطری نظام کی تباہ کاریوں کا حل دوسرا غیر فطری نظام نہیں کر سکتا۔ غیر فطری نظام کا حل صرف فطری نظام کر سکتا ہے جسے ہم اسلام کہہ کر پکارتے ہیں۔ لہٰذا ہر سلیم الطبع انسان کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہمارے موجودہ غیر فطری نظام کی جگہ (جس میں مسلم و غیر مسلم کے آج کوئی تمیز نہیں) فطری نظام مسلط ہو جائے۔ لیکن اگر اس کی کوشش نہ ہوئی تو ایک غیر فطری نظام کی جگہ دوسرا غیر فطری نظام آجائے گا وکذالک نولی بعض الظالمین بعضا (اس طرح ہم ایک غیر فطری نظام کو دوسرے غیر فطری نظام پر مسلط کر دیتے ہیں) اس لئے کہ نظامِ سرمایہ داری کے مٹنے پر مشکل ہے کہ وہ کمیونزم کا حریف ہو سکے لیکن اسلام اور کمیونزم کو ایک سمجھنا بنیادی غلطی ہے۔ نہ کمیونزم اسلام ہے اور نہ ہی وہ اس کے مقابل ٹھہر سکتا ہے۔

سلیم! یہ خط بہت لمبا ہو گیا۔ لیکن کیا کیا جائے جب تم بات ہی ایسی چھیڑ دو تو۔ اچھا، خدا حافظ۔

والسلام

پرویز

باب المراسلات

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

(۱) آپ کے ہاں تمسک بالقرآن کی دعوت ہے۔ درآنحالیکہ شارع علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ حضورؐ نے دنیا میں دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ ایک قرآن دوسری سنت۔ موخرالذکر کے باب میں آپ قریب قریب خاموش ہیں۔ کیا یہ روش بروئے قرآن درست ہے! آپ کے نزدیک سنت سے کیا مفہوم ہے اور اس کا علم امت تک کس ذریعہ سے پہنچا؟

طلوع اسلام۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں۔ کتاب اور سنت۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ دو چیزیں ہیں۔ کتاب اللہ اور اہل بیت؛ اور تیسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے امت کے لئے صرف کتاب اللہ چھوڑی۔

ہمارے پاس کوئی خارجی شہادت ایسی نہیں جس سے ہم آج یقینی طور پر کہہ سکیں کہ ان روایات میں سے کونسی رسول اللہؐ کی ہے۔ یہ تینوں روایات، کتب احادیث میں مذکور ہیں اور رسول اللہؐ کی طرف منسوب۔ کتب احادیث حضورؐ کے سینکڑوں سال بعد مدون ہوئیں اور اس طرح کہ زید نے سنا بکر سے اور بکر نے سنا خالد سے اور خالد نے سنا عمر سے۔ . . . . . ظاہر ہے کہ یہ طریق نہ علم کہلا سکتا ہے (کہ علم کے لئے یقین ضروری ہے) اور نہ ہی شہادت (کہ شہادت عینی ہونی چاہیے)۔ لامحالہ ہمیں داخلی شہادت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ داخلی شہادت یہ ہے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ رسول اللہ پر نازل ہوا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا۔ اس کے ایک حرف تک میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ تو یقینی ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اب اگر اس کے ساتھ سنت بھی رسول اللہؐ نے چھوڑی تھی تو وہ کونسی کتاب ہے جس میں خود رسول اللہؐ نے اپنی سنت کو جمع کر کے امت کو دیا تھا۔ اگر رسول اللہؐ نے قرآن کے ساتھ کوئی مجموعۂ سنن بھی امت کو دیا ہوتا تو جس طرح صحابہؓ نے قرآن کی نقول اطراف و جوانب میں پہنچائی تھیں وہ اس مجموعہ کی بھی نشر و اشاعت کرتے۔ نشر و اشاعت نہ سہی، خود مدینہ طیبہ ہی میں اس کا کوئی نسخہ ہوتا۔ ایسا تو کہیں نہیں ہوا۔ اس کے برعکس خود حضرات جامعین احادیث نے بھی تسلیم کیا ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعے کسی ایسے مجموعہ سے مرتب نہیں فرمائے جسے رسول اللہؐ نے چھوڑا ہو بلکہ انھوں نے ان روایات کو لوگوں کی زبانی سن کر جمع کیا ہے

اور پھر ان میں سے جسے قابلِ قبول سمجھا اسے اپنے مجموعہ میں درج کیا ہے۔ (چنانچہ امام بخاریؒ نے قریب چھ لاکھ روایات میں سے پانچ لاکھ چورانوے ہزار کو مسترد کر دیا اور قریب چھ ہزار احادیث کو اپنے ہاں درج کیا)۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے قرآن کے علاوہ کوئی اور مجموعہ امت کے لئے نہیں چھوڑا۔

کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے قرآن کو تو لکھوا کر مجموعہ کی شکل میں چھوڑا لیکن اپنی سنت (احادیث) کو ایسے ہی چھوڑ دیا کیونکہ وہ عام طور پر صحابہؓ کو یاد تھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر سنت بھی امت کے لئے ایسی ہی واجب الاتباع ہوتی جیسی قرآن ہے تو رسول اللہ کا فریضۂ رسالت تھا کہ اسے بھی محفوظ اور مستند طور پہ امت کو دے کر تشریف لے جاتے۔ لیکن نہ رسول اللہؐ نے ایسا کیا اور نہ صحابۂ کبار ہی نے اس کی ضرورت سمجھی اس داخلی شہادت سے واضح ہے کہ رسول اللہؐ نے امت کے لئے ایک ہی چیز چھوڑی تھی اور وہ کتاب اللہ تھی۔

رسول اللہ خود بھی قرآن ہی کی اتباع فرماتے تھے اور امت کو بھی اسی کی اتباع کی تاکید فرماتے تھے۔ حضورؐ نے قرآن کے متعین شدہ احکام کو نافذ کیا اور اس کے اصولی احکام کی جزئیات، اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق مرتب فرمائیں۔ قرآن کے متعین شدہ احکام اور اصول سب قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ باقی رہیں اصولی احکام کے تابع جزئیات، سو انھیں ہر زمانہ میں، وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی حکومت کو متعین کرنا تھا۔ جب تک اسلامی حکومت رہی، وہ ان جزئیات کو متعین کرتی رہی۔ جب اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا، یہ کام بھی رک گیا۔ اب اگر کہیں پھر اسلامی حکومت کا قیام ہو تو وہ پھر ان جزئیات کو مرتب کرے۔ اس تعیین جزئیات میں وہ حکومت تاریخی نظائر سے بھی مدد لے سکتی ہے۔ یہ نظائر کتبِ احادیث سے مل سکتے ہیں، لیکن بڑی تحقیق و کاوش کے بعد اس لئے کہ ان مجموعوں میں صحیح اور غلط سب ملے جلے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، ہمارے پاس کوئی خارجی شہادت ایسی نہیں جس سے ہم یقینی طور پر کہہ سکیں کہ فلاں روایت صحیح ہے اور فلاں غلط۔ داخلی طور پر ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ، چونکہ رسول اللہؐ کا کوئی قول و عمل قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے ہم ان مجموعوں کو قرآن کی روشنی میں پرکھیں اور جو کچھ قرآن کے مطابق ملے اسے الگ کر لیں۔ اس کے متعلق ہم کہہ سکیں گے کہ اس کا امکان ہے کہ یہ رسول اللہؐ ہی کے اقوال و اعمال ہوں۔ یقینی طور پہ پھر بھی ہم انھیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ اور اس کے بعد ہم ان سے امکانی نظائر (Possible precedents) کے طور پہ متمتع ہو سکیں گے۔ یعنی اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق، قرآنی اصول کے جزئیات متعین کرنے میں ان نظائر سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

یہ ہے "سنت" کا مفہوم ہمارے نزدیک اور یہ ہے اس کا امکانی ذریعۂ علم۔ طلوعِ اسلام اس باب میں خاموش نہیں رہا۔ وہ تو شروع سے اس کی صحیح پوزیشن کی وضاحت میں ساعی ہے۔ باقی رہی اس کی دعوت تمسک بالقرآن، سو یہ وہی دعوت ہے جو خود رسول اللہؐ کی دعوت تھی۔ حضورؐ بھی تمسک بالقرآن

ہی کی دعوت دیا کرتے تھے اور آپ کی بعثت گرامی سے یہی مقصود تھا۔ اور عمل بالقرآن ہی کا نام عمل بالسنت ہے کہ حضور بھی قرآن ہی پر عمل کیا کرتے تھے۔

---

(۲) "آپ کے ہاں اسلام کے عجمی تصور سے بیزاری کا اظہار ہے۔ لیکن کاش کوئی مضمون یہ بھی ہوتا کہ یہ عجمی تصور ہے کیا؟"

طلوعِ اسلام: "عجمی تصور" کے متعلق اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے کہ

تفصیلِ معنیٔ غمِ الفت طویل ہے۔ اور یوں تو خفیف سا اک دل میں درد ہے۔

تفصیل و اطناب کی طرف جایئے تو مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا ہر گوشہ عجمی تصورات کی تصویر ہے۔ اس کی شرح کہاں تک کی جائے۔ اور اختصار کی طرف آیئے تو یہ سب کچھ اس ایک فقرہ میں سما جائے گا کہ جو کچھ قرآن کے خلاف ہے، سب عجمی تصورات کا نتیجہ ہے خواہ اسے کیسا ہی مقدس اسلامی نام کیوں نہ دیدیا جائے۔

اسلام نام ہے اس جماعتی نظام کا جو دنیا میں قرآنی آئین کو نافذ کرنے کا ضامن ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہے عجمی تصور ہے۔

---

(۳) "روایت ہے کہ حضور کا سایہ نہ تھا، لیکن اس گنہگار کو اس میں تامل ہے۔ یعنی بشریت کے ساتھ سایہ نہ ہونا کیونکر ممکن ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو عہدِ نبوی میں منکرینِ رسالت کے لئے ایک حجت ہوتا یا پھر اس کی کوئی تاویل ہوگی کہ یہ سایہ صحابہ کرام سے غائب ہوگا اور غیر صحابہ کے سامنے موجود۔ بہرحال آپ کے نزدیک یہ روایت کہاں تک معتبر ہے؟"

طلوعِ اسلام: ہمارے نزدیک تو معتبر خدا کی کتاب ہے جس میں ایک بار نہیں، متعدد بار یہ صراحت موجود کہ رسول اللہ کو قرآن کے سوا کوئی اور معجزہ نہیں دیا گیا۔ لیکن مسلمانوں کے ذوقِ اعجوبہ پسندی نے اس قسم کے ہزاروں معجزات حضور کی طرف منسوب کر رکھے ہیں اور کتبِ روایات ان سے بھری پڑی ہیں۔ قرآن کی صراحت کے بعد کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ (اس اجمال کی تفصیل کے لئے محترم پرویز صاحب کی کتاب "معارف القرآن" کی چوتھی جلد کا انتظار فرمایئے جس میں معجزات پر عجیب و غریب بحث کی گئی ہے)۔

---

(۴) "حضرت اقبالؒ خلافتِ الٰہیہ کی طرف داعی ہیں۔ یہ دعوت حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء نے عملاً اٹھائی تھی اور علمی حیثیت سے حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہم نے۔ لیکن آپ اس باب میں حضرت اقبال کو پیش کرتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس مقصدِ عظیم میں تو سید احمد شہیدؒ کا مقام اور بھی بلند ہے۔"

طلوعِ اسلام۔ حضرت سید شہیدؒ اور ان کے رفقاء کی بلندیٔ مقام میں کیا کلام ہے جنھوں نے خلافتِ الٰہیہ کے تمکن کے لئے عملاً قدم اٹھایا اور اس راہ میں اپنی جانیں تک دیدیں۔ رضی اللہ عنہم اور رضوا عنہ۔ طلوعِ اسلام کے سابقہ اوراق الٹ کر دیکھئے۔ ان حضرات علیہم الرحمۃ کا تذکرۂ جلیلہ متعدد مقامات پر باعثِ سعادت و برکات نظر آئے گا۔ لیکن ان کی زندگی عملی جہاد میں گذری اس لئے انھوں نے اپنے پیچھے ایسا لٹریچر نہیں چھوڑا جس کی روشنی میں اس مقصدِ عظیم کے مختلف گوشوں کی وضاحت کی جا سکے۔ علامہ اقبالؒ نے اس مقصدِ رفیع و منیع کو سامنے رکھ کر ہمارے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق، اس کے مختلف پہلوؤں کو اس قدر واضح کیا ہے کہ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ خلافتِ الٰہیہ سے مفہوم کیا ہے اور دنیا کے دیگر نظامہائے زندگی کس طرح اس سے مختلف ہیں۔ فکرِ اقبال کی نشر و اشاعت، درحقیقت خلافتِ الٰہیہ کی تبیین و توضیح کا ذریعہ ہے اور طلوعِ اسلام اسی مقصد کے پیشِ نظر اُن کے "نورِ بصیرت" کو عام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی رہے شاہ ولی اللہؒ یا دیگر اسلافِ کرام۔ سو یا تو ان کے ہاں یہ تصور واضح اور صاف طور پر ملتا نہیں، اور اگر کہیں ملتا ہے تو اسے انھوں نے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا ہے، اس لئے وہ عصرِ رواں کے تقاضوں کے پیشِ نظر زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ طلوعِ اسلام نہ اشخاص پرست ہے نہ فرقہ پرست۔ اس کے نزدیک متقدمین ہوں یا متاخرین، ایک فرقہ کے ہوں یا دوسرے کے، جس جس نے جہاں جہاں قرآنی تصوریات کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی چشمِ اعتراف اس کے سامنے جھکی ہوئی ہے اور اس کی نشر و اشاعت اس کے لئے وجۂ مسرت و باعثِ سعادت ہے۔ یہی جذبہ پیغامِ اقبال کی نشر و اشاعت میں کارفرما ہے۔ اور یہ بھی اس کے نزدیک ——— چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے۔

---

(۶) جی چاہتا ہے کہ انگریزی کا ایک رسالہ ہو، اس کا نام ہو اقبال۔ اور اس رسالہ کی اشاعت انگلستان میں ہو اور امریکہ میں۔ کاش حکومت یہ کام کرے یا کوئی شیدائے اسلام و اقبالی ادارہ؟

طلوعِ اسلام۔ "یا رب ایں آرزوئے او چہ خوش است"

لیکن کرے تو وہ جسے اس کی اہمیت کا احساس ہو۔ جن کے پاس ذرائع ہیں انھیں احساس نہیں اور جو احساس کی آتشِ خاموش میں پھنک رہے ہیں ان کے پاس ذرائع کا فقدان ہے۔

شب برات| ایک اور صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

"شب برات کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے؟ یہ کیا تقریب ہے؟ اسے لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

یہ تقریب کسی واقعہ کی یاد میں نہیں منائی جاتی۔ بعض روایات میں اس رات کی فضیلتوں کا ذکر ہے۔ یہی اس کی سند ہے۔ لیکن مولوی صاحبان سے پوچھئے تو وہ اسے لیلۃ القدر بیان کرتے ہیں۔ چند سال اُدھر کا ذکر ہے۔ دہلی ریڈیو سے ایک بہت بڑے مولانا اپنی تقریر میں شب بارات کی قرآنی سند بیان فرما رہے تھے۔ اور وہ سند تھی سورۂ دخان کی یہ آیت کہ فیھا یفرق کل امر حکیم (۴۴/۴) اس رات ہر ایک حکمت والا معاملہ فیصل کر دیا گیا۔ اس "قرآنی سند" کے بعد انہوں نے تفصیلاً بتا دیا کہ اس رات کس طرح آنے والے سال کے لئے لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سورۂ دخان میں یہ آیات یوں ہیں۔

انا انزلنہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین ۔ فیھا یفرق کل امر حکیم ۔ (۴۴/۳-۴)

ہم نے قرآن کو ایک بابرکت رات میں اتارا ہے۔ ہم ہمیشہ (وحی کے ذریعے قوموں کو) ڈراتے رہے ہیں۔ (وہ بابرکت رات) جس میں ہر ایک حکمت والا معاملہ فیصل کر دیا گیا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ اس رات کا ذکر ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ (انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر)۔ اور قرآن کے نزول کی ابتدا رمضان میں ہوئی تھی (شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن)۔ لہٰذا اس سے واضح ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے مہینے میں آئے گی اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی تھی، لیکن ہم ہیں کہ پہلے شعبان کے مہینے میں لیلۃ القدر (شب بارات) مناتے ہیں اور پھر رمضان کے آخری عشرہ میں بھی اس کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ غور کیجئے۔ ایک رسم کی گرفت کس قدر سخت ہوتی ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے اس رسم کے ضمن میں صرف ہو جاتے ہیں اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا سوچنے کی زحمت نہیں گوارا کرتا کہ بالآخر یہ کچھ کیوں کیا جاتا ہے اتنا سوچنا تو ایک طرف، یہاں تو حالت یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں جب خوراک کی کمی کی وجہ سے میدہ اور سوجی کمیاب ہو گئی تھی تو مسلمانوں نے حکومت کو خاص طور پر متنبہ کیا تھا کہ اگر شب بارات پر میدہ اور سوجی مہیا کرنے کا انتظام نہ کیا گیا تو اسے "مداخلت فی الدین" سمجھا جائے گا۔ چنانچہ کراچی میں اس مرتبہ خاص طور پر میدہ، سوجی اور زائد چینی بہم پہنچانے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ "اسلامی حکومت" کی برکات کا احساس ہو جائے۔ کیا سچ کہا ہے حکیم الامت نے کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ امت روایات میں کھو گئی

رعدیہ

(جناب اسد ملتانی صاحب)

ایک دن الفاظ کے ماخذ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی کہ بھائی اسلم نے کہا، کہیں لفظ ریڈیو کی اصل عربی کے "رعد" سے تو نہیں۔ بات دل کو لگی کیونکہ رعد و برق کا باہمی تعلق ظاہر ہے یعنی رعد بجلی کے اثر سے پیدا ہونے والی آواز ہی کا نام ہے اور ریڈیو میں بھی عین یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔

خیال ہوا کہ ریڈیو کا موجد مارکونی ایک اطالوی سائنسداں تھا اور سندھی زبان کی طرح اطالوی زبان میں بھی ہائے مختفی کو واؤ سے بدل دینا ایک عام بات ہے۔ اسی لئے دوسری زبانوں میں لفظ ریڈیو اطالوی تلفظ کے ساتھ رائج ہو گیا۔ حتیٰ کہ خود عرب بھی اسے "راديو" کہنے لگے۔ ورنہ اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو عربی میں اس کا صحیح تلفظ "رعدیہ" ہونا چاہئے۔

بہت دنوں سے یہ خیال ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ آخر ایک دن میں نے جناب مفتی محمد شفیع صاحب سے لفظ "رعد" کا عربی میں حقیقی مفہوم دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ رعد کا لفظ دراصل کیفیت اضطراب وارتعاش کو ظاہر کرتا ہے، بخار سے جو لرزہ یا جاڑے سے جو کپکپی کی حالت پیدا ہوتی ہے اس کو بھی رعد ہی کے ایک صیغے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ بادل کی گرج بھی بجلی کی لرزش سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس پر بھی رعد کا اطلاق ہو گیا۔

لفظ رعد کی اس تحقیق سے میرے قیاس کی پوری پوری تائید ہو گئی کیونکہ انگریزی زبان میں ریڈی ایٹ (Radiate) اور ریڈی ایشن (Radiation) کے الفاظ روشنی، حرارت اور بجلی کے تموج اور ارتعاش ہی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ریڈیو کا عمل بھی آواز کی برقی لہروں کی "رعدیت" پر مبنی ہے۔ لہٰذا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ریڈیو دراصل رعدیہ ہی ہے اور عربی، فارسی، اردو اور ایسی تمام اسلامی زبانوں میں اسے رعدیہ ہی کہنا چاہئے۔

رعد کا مادہ متعین ہو جانے سے ترجمہ کی چند اور مشکلات بھی دور ہو جاتی ہیں۔ مثلاً براڈ کاسٹ کے لئے تو "نشر" "نشریہ" اور "نشریات" ایسے نہایت موزوں الفاظ رائج ہو چکے ہیں لیکن ریڈیو کے ٹرانسمشن (Transmission) کے لئے کوئی مناسب ترجمہ نہیں ملتا۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو

کے اردو رسالہ "آواز" میں فرسٹ ٹرانسمشن اور سیکنڈ ٹرانسمشن کو "پہلی سبھا" اور "دوسری سبھا" لکھ کر گذارہ کیا جاتا تھا اور اب ریڈیو پاکستان کے رسالہ "آہنگ" میں "پہلی مجلس" اور "دوسری مجلس" سے کام نکالا جاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ ٹرانسمشن کا مفہوم نہ سبھا سے ادا ہوتا ہے اور نہ مجلس سے۔ البتہ رعد کے مادے سے "ترعید" بالکل صحیح ترجمہ ہو جاتا ہے اور ترعیدِ اول اور ترعیدِ ثانی یا پہلی ترعید اور دوسری ترعید وغیرہ نہایت مناسب الفاظ میسر آجاتے ہیں۔

اسی طرح ٹرانسمٹر (Transmitter) کا بھی ترجمہ عام طور پر "آلۂ نشرِ صوت" کر دیا جاتا ہے لیکن اس کا تکلف ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں "صوت" کا لفظ اس میں ایک ایسا اضافہ ہے جو ٹرانسمٹر کے لفظ میں کہیں موجود نہیں۔ اس کے بجائے رعد کے مادے سے "مرعاد" ایک ایسا اسم آلہ بن سکتا ہے جو ٹرانسمٹر کا بالکل صحیح ترجمہ ہے۔

الغرض "رعدیہ" کا مصدر تحقیق ہو جانے سے متعلقہ الفاظ کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے جس سے تمام السنۂ اسلامیہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

[محترم اسد صاحب کی یہ تحقیق دنیائے اصطلاحات کے لئے مفید نتائج کی طرف راہ نمائی کا موجب ہوگی۔ جہاں تک ریڈیو پاکستان کا تعلق ہے، یہ جدید اصطلاح لفظی حیثیت سے زیادہ معنوی حیثیت سے مناسبت رکھتی ہے۔ عربی میں مصلف تحت راعدۃ" ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کوئی کام کی بات نہ کرے اور یونہی بلا علم و تحقیق بولتا چلا جائے۔
طلوع اسلام]

جوان ہمتی

کراچی میں "کریسنٹ سوپ" کا ایک کارخانہ ہے۔ اس کا مالک، ایک جواں ہمت نوجوان، چھ ماہ قبل یہاں آیا اور دیکھا کہ ایک ایسے کارخانہ کی یہاں ضرورت ہے لیکن اس کے لئے سامان و ذرائع کی کمیابی ہی نہیں نایابی ہے وہ مزدوروں کی طرح اٹھا اور چھ ماہ کے اندر اندر ایک کارخانہ قائم کر دیا جس میں آج قریب سوا لاکھ روپیہ روزانہ کا صابن تیار ہو رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں سرمایہ کا بھی بہت کچھ دخل ہے، لیکن ہمارے ہاں کتنے سرمایہ دار ہیں جو اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں، اس کارخانہ کے جواں ہمت مالک کو کہ اس نے اپنی قوت بازو سے ایسی قابلِ تقلید مثال قائم کر دی ہے۔

بقیہ صفحہ

لاہور میں منعقد ہوا، صوفی عبدالحمید نے اس قرارداد کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے کہا:

گورنر (پنجاب) نے اس وقت کے قائم مقام صدر شیخ صادق حسن کے ذریعہ مسلم لیگ کو تعاون کی دعوت دی تھی۔

اس "انکشاف" پر صدر باری صاحب بہت برہم ہوئے اور مقرر کو ٹوکا اور یاد دلایا کہ مجلس عاملہ کی بحثیں راز ہوتی ہیں جنہیں برسرِعام بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ان ٹکڑوں کو یکجا کر کے دیکھئے تو مسلم لیگ کی پوزیشن یوں ہوگی۔ تعطل آئین کے ساتھ ہی گورنر نے مسلم لیگ کو تعاون کی دعوت دی، وزیر اعظم پاکستان نے مسلم لیگ سے ان اصحاب کے نام مانگے جو گورنر کے مشیر مقرر ہوں، مسلم لیگ نے گورنر کی آمرانہ حکومت اور منافی مفاد عوام اور منافی مسلم لیگ کارروائیوں کے پیش نظر ان دعوتوں کو مسترد کر دیا کیونکہ وہ سر فرانسس موڈی کے شخصی استبداد و تظلم کے ساتھ اپنے آپ کو منسوب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس روش کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ کا یہ کہنا کہ اس نے تعاون کی پیشکش کی، متضاد نہیں تو مبہم ضرور معلوم ہوتا ہے۔ مسلم لیگ نے یہ نہیں بتایا کہ گورنر راج کی غیر آئینیت کو کم کرنے کے لئے اس نے کس نوعیت کا تعاون کرنا چاہا تھا۔ آئینی طریقوں کے مطابق ایسا تعاون مشیروں کے تقرر کی صورت میں ہی ہو سکتا تھا۔ اگر یہ صورت نہیں تھی تو مسلم لیگ نے کونسی عملی تجویز پیش کی؟ مسلم لیگ کو اس کی وضاحت کرنی چاہیے تھی تاکہ پبلک یہ فیصلہ کر سکتی کہ گورنر اور محترم لیاقت علی خاں کی حصول تعاون کی دعوتوں اور مسلم لیگ کی تعاون کی پیشکش میں کیا فرق تھا اور کس فریق کا رویہ حق بجانب اور مستحسن تھا۔ بہرکیف مسلم لیگ نے یہ موقف قائم کیا کہ سر فرانسس موڈی کو برطرف کر دیا جائے اور اس کے بجائے پاکستانی گورنر مقرر کیا جائے۔ نیز مسلم لیگ گورنر موڈی سے حکومت کی شرط پر تعاون کے لئے تیار نہیں۔ صدر باری نے اپنے بیانات میں اس پر اور تشدد برتا۔ ۲ جون کو آپ نے فرمایا کہ مغربی پنجاب ہی ایک بدقسمت صوبہ ہے جو غیر پاکستانی گورنر کے ماتحت ہے، حالانکہ مرکز کے سب محکمے پاکستانی وزراء کے ماتحت ہیں۔ یہ "جذبات" قابل قدر ہو سکتے ہیں لیکن بیان خلاف واقعہ ہے۔ سرحد اور مشرقی بنگال کے گورنر موڈی کی طرح غیر پاکستانی اور انگریز ہیں، لیکن باری صاحب نے کراچی کے مرکزی وزیروں کا تو ذکر کر دیا اور ان صوبوں کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ گورنر کے اعتبار سے مشابہت ان صوبجات سے ہے۔ یکم جون کے بیان میں آپ نے مسلم لیگ کی روش کو اور واضح کیا جبکہ آپ کراچی میں وزیر اعظم پاکستان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے بعد پنجاب پہنچے۔ ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا:

موجودہ گورنر کے مشیر مقرر کرنے کی دعوت کو میں ہرگز قبول نہیں کر سکتا، خواہ ان مشیروں کو مکمل اختیارات کیوں نہ دیئے جائیں اور ان کو صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کے سامنے ہی جوابدہ کیوں نہ بنا دیا جائے۔

اس اعلان کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مسلم لیگ گورنر موڈی کے مشیر کی حیثیت قبول نہیں کرے گی کیونکہ وہ سرے سے اس کی برطرفی کا ہی مطالبہ کر رہی ہے۔ اب آپ نگہ بازگشت ڈالئے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلم لیگ

کی روش شروع سے ہی یہی تھی تو اس نے کس شکل میں حکومت سے تعاون کرنا چاہا تھا جب حکومت ---- گورنر یا مرکزی حکومت ---- نے ٹھکرا دیا۔ باری صاحب سے اخباری نمائندہ نے ایک اور سوال کیا جس میں پوچھا گیا کہ اگر مرکز اپنے فیصلہ پر قائم رہے (یعنی گورنر موڈی کو برطرف نہ کرے) تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا:

یہ صورت میرے تصور میں نہیں آسکتی۔ مجھے امید ہے کہ مرکز صوبے کے متفقہ فیصلہ کو رد نہیں کرے گا۔

صوبائی مسلم لیگ کے صدر باری صاحب اس فیصلہ پر ایسے متشدد نظر آرہے تھے کہ اس قسم کے بیانات سے عام طور پر قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں کہ اس مطالبہ کی نامنظوری کی صورت میں صوبائی مسلم لیگ نافرمانی شروع کردے گی۔ باری صاحب کو اس قیاس آرائی کی تردید بھی کرنا پڑی۔

یہ کچھ برسرِعام ہوا۔ کچھ پس پردہ بھی ہوا۔ کراچی میں باری لیاقت سے ملے، باری خلیق سے ملے۔ راولپنڈی میں لیاقت پھر باری سے ملے۔ بالآخر اس تصفیہ کا حل دریافت ہوگیا۔ ان مذاکرات میں وزیراعظم پاکستان کے اس فارمولا پر فریقین نے اتفاق کیا:

(۱) گورنر کے پانچ مشیر ہوں گے، جنھیں وزیراعظم پاکستان مقرر کریں گے اور جن کے نام مسلم لیگ کے تجویز کردہ ہوں گے۔

(۲) مشیروں کو وزراء کے اختیارات حاصل ہوں گے اور وہ بطور کابینہ کام کریں گے۔ مشیروں اور گورنر کے اختلافات کا تصفیہ مرکز کرے گا۔

مسلم لیگ کی عاملہ نے اس فارمولا کو باقاعدہ طور پر منظور کرلیا ہے اور مشیروں کے انتخاب و تقرر کا مرحلہ درپیش ہے۔ یکم جون کو مسٹر لیاقت علی خاں سے کراچی میں ملاقات کرلینے کے بعد لاہور میں باری صاحب نے فرمایا تھا کہ ان سب باتوں کے باوجود انہیں کامیابی کی امید ہے۔ وہ اب اس فارمولا کو اپنی کامیابی ہی قرار دے رہے ہیں۔ وہی گورنر موڈی ہے جس کی برطرفی کا مطالبہ ہو رہا تھا اور مسلم لیگ اور مسلم لیگ کے صدر نے یہ ناقابل مفاہمت روش اختیار کرلی تھی کہ جب تک غیر پاکستانی گورنر موجود ہے مشیروں کے تقرر کا سوال خارج از بحث ہے۔ وہ گورنر بحال رہے گا اور مسلم لیگ کے مشیر اس کی کابینہ کی حیثیت سے کام کریں گے۔ مسلم لیگ کی قراردادوں اور اس کے صدر کی وضاحتوں نے اس قسم کی مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن آج مسلم لیگ کامیاب ہوگئی ہے۔ ہاں کامیاب! اتنے دن اس کا اخبارات میں چرچا ہوتا رہا اور پبلک اس ہنگامہ آرائی کے تصفیہ کا دلچسپی سے انتظار کرتی رہی۔ یہ کامیابی بجائے خود کافی ہے۔ مسٹر لیاقت علی خاں واقعی کامیاب رہے کہ انہوں نے اس "بالک ہٹ" کا حل دریافت کرلیا۔

اس اتفاق اور کامیابی پر خوشی کے شادیانے بجائے جارہے ہیں لیکن بدقسمت مغربی پنجاب کی رُوح

آج بھی خوابیدہ ہے۔ محنت کش اور ستم رسیدہ عوام کی مشکلات کا حل نہ پہلے تھا نہ اب ہوگا۔ جو منشیر مسلم لیگ چنے گی وہ مسلم لیگ کے تو نمائندے ہوں گے لیکن صوبائی عوام کے نمائندے نہیں ہو سکتے۔ مسلم لیگ یکسر غیر نمائندہ جماعت ہے، وہ عوام میں اعتماد کھو بیٹھی ہے۔ آخر مسلم لیگ اب منشیر کہاں سے لائیگی! اس کے پاس موزوں آدمی ہوتے تو اپنی وزارت کو برطرف کیوں ہونے دیتی۔ اس وقت وہ متبادل نام پیش کرکے نئی وزارت مرتب کر سکتی تھی۔

عمائدِ حکومت اور ارکینِ ملت، یعنی قوم کے یہ خود ساختہ نمائندے، اس قسم کی طفلانہ حرکات سے دھول اڑا رہے ہیں اور قوم بیچاری مصیبتوں کے پہاڑ کے نیچے پسی جا رہی ہے اور رہ رہ کر آسمان کی طرف تک کر کہہ رہی ہے کہ

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔

اور کوئی صاحب نظر دور بیٹھا سرد آہ بھر کر کہہ رہا ہے کہ۔ بچوں کے ہاتھ میں جا تو آگیا ہے۔ اللہ رحم کرے۔

قرآن کا پہلا صفحہ اُلٹیے اور اس میں پہلی صورت کی پہلی آیت کو دیکھیے۔ اس میں کس خدا کی ربوبیت کبریٰ کا تذکرہ ملے گا۔ الحمد للہ رب العالمین۔ فی الحقیقت ربوبیت ہی وہ بنیادی صفت ہے جس پر عالمین (تمام کائنات) کا انحصار ہے۔ آپ پہلے صفحہ کے بعد سارے قرآن پر نظر ڈالتے جائیے، ہر مقام پر نظامِ ربوبیت کا "خوانِ گرانمایہ" بچھا ہوا دکھائی دے گا۔ یہ نظامِ زندگی کا بڑا اہم گوشہ ہے۔

حکومتِ الٰہیہ، جس کا منشاء خدا کے رنگ کو دنیا میں عام کرنا ہے، خدا کی مختلف صفات کے محسوس مظاہر کا نام ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ ربوبیت، اس حکومت کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ "زمین پر کوئی چلنے والا نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے نہ لے رکھا ہو" تو اس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کا اولیں فریضہ اس کے دائرہ کے اندر بسنے والے تمام "چلنے والوں" کے رزق کا فراہم کرنا ہے۔ حکومتِ خداوندی کا سب سے پہلا فریضہ اس امر کا اطمینان ہوگا کہ اس کے حیطۂ اثر میں کوئی متنفس بھوکا نہیں سویا۔

پھر اس حکومت کا یہ فریضہ، اپنے دائرہ اثر و نفوذ سے آگے بڑھ کر عالمگیر حیثیت اختیار کر لیتا ہے کہ یہ اس خدا کی حکومت ہے جس کی ربوبیت تمام عالمین پر چھائی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے، اس حکومت کا نظام اس انداز کا ہوگا کہ اس کی رو سے دنیا میں کوئی متنفس بھوکا نہ رہے۔

آج دنیا میں اس نظامِ حکومت کے صرف تذکرے باقی ہیں۔ عملاً یہ کہیں موجود نہیں ہے۔ بایں ہمہ، چونکہ یہ باتیں مسلمان کے تحت الشعور میں خوابیدہ ہیں، اس لئے کبھی کبھی ان کا مظاہرہ اس انداز میں ہو جاتا ہے کہ آج کی "سوداگروں کی دنیا" جس کا چلن ہی بیع و شریٰ پر ہے، اسے باور ہی نہیں کر سکتی کہ ایسی آواز کا

بھی امکان ہے۔ اس قسم کا ایک مظاہرہ تھا جو پچھلے دنوں پاکستان کے وزیر اعظم، محترم لیاقت علیخاں صاحب کی طرف سے کشمیر کے حدود میں ہوا۔

کشمیر کا وہ حصہ جو ہندوستان کے قبضہ میں، قحط کی جانگسل اور روح فرسا مصیبت میں گرفتار ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ملک سے "جنگ" ہو وہاں اس قسم کے حالات کا پیدا ہونا بڑی "مبارک فال" سمجھا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ وہ شدید سے شدید تر حیثیت اختیار کر جائیں۔ وہاں کے قحط کی دردناک اطلاعات باہر آئیں تو محترم لیاقت علی خاں صاحب نے اعلان کر دیا کہ پاکستان مصیبت زدگان کشمیر کے لئے حسب ضرورت مفت غلہ فراہم کرنے کی پیش کش کرتا ہے۔ کشمیر کمیشن اس غلہ کو مصیبت زدگان تک پہنچانے کا انتظام کر دے یا اس انتظام کو ریڈ کراس سوسائٹی جیسے غیر جانبدار ادارہ کے سپرد کر دے۔ ہمارا مقصد انسانی جانوں کو تلف ہونے سے بچانا ہے۔ اور بس!

ہم محترم لیاقت علی خاں صاحب کو ان کی اس پیش کش پر مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں کہ انھوں نے نوع انسانی کی مصیبت پر عملی ہمدردی کا ثبوت دیکر اسلام کی صحیح روایت کو زندہ کر دیا۔

ہمیں امید ہے کہ ان کی وہ آنکھ جو فاقہ کشان کاشمیر کی حالت زار پر یوں نمناک ہوئی ہے، پنجاب کے سوختہ بخت پناہ گزینوں کے الم انگیز اور جگر سوز مصائب پر بھی اشک بار ہوگی۔

ایک نورانی صبح

پرویز

۱۹ رجون (اتوار) کی صبح بھی میرے لئے کیسی سہانی صبح تھی! یمن وسعادت کی صبح، خیروبرکت کی صبح، بہجت ومسرت کی صبح، فخرومباہات کی صبح۔

آج آپ کو رجعت الی القرآن (Back to Quran) کی آواز چاروں طرف سے سنائی دیتی ہے۔ لیکن آج سے ستر اسی برس ادھر یہ آواز بڑی غیرمانوس اور ناآشنائے گوش تھی۔ قوم کے افق ذہنی پر غیرقرآنی تصورات بری طرح سے مسلط تھے۔ اعمالِ حیات یکسر غیراسلامی رسوم وقیود کے پابند ہوچکے تھے۔ حقیقت، عجم کی نگاہ فریب داستانوں میں کھو چکی تھی۔ قرآن، صرف ثواب کی خاطر تبرکاً پڑھا جاتا تھا یا مرتے وقت مردوں کو سنایا جاتا تھا ــــ کہ از یٰسین او آساں بمیری ــــ عام مسلکِ زندگی یا روایت پرستی تھا یا زاویہ نشینی۔ دین نام تھا چند لفظی عقائد اور رسوم ومظاہر کی پابندی کا۔ مذہبی بحثیں مشغلہ تھیں یا تو آمین بالخفی وبالجہر قسم کی فروعات پر اور یا حدوث وقدم مادہ اور تجسیم وتنزیہ جیسے منطقی گورکھ دھندوں پر۔ ایسے ماحول اور اس قسم کی فضا میں اگر کسی گوشے سے یہ آواز بلند ہو کہ مسلمانوں! تمہاری زندگی کا راز قرآن اور خالص قرآن کو سمجھنے اور اس پر بے غل وغش عمل کرنے میں ہے، تو کس قدر باعظمت ہوگا وہ گوشہ جہاں سے یہ آواز بلند ہوئی ہوگی اور کیسی بے باک وپرخلوص ہوگی وہ زبان جس نے اس آواز کو بلند کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ فی الحقیقت ایک بڑے انسان کی عظمت کا راز ہی اس میں ہے کہ وہ اپنے زمانے کے عوام کی رَو کے ساتھ نہیں بہہ جاتا بلکہ ادراکِ حقیقت کے بعد ان کے ذہنی رجحانات کے دھارے کا رخ موڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ گوشہ تھا، عظیم آباد (پٹنہ) کا ایک محلہ، اور یہ آواز تھی، مولانا حافظ محب الحق صاحبؒ کی جن کی ذات کے ساتھ انتساب سے "شمس العلماء" کے خطاب نے بعد میں فخر حاصل کیا۔ اس مردِ مومن نے قریب ستر اسی برس ادھر یہ آواز بلند کی اور پھر ساری عمر اسی دعوت کے عام کرنے میں صرف کردی۔ اس آواز کی کس قدر مخالفت ہوئی ہوگی، اس کا ہم صحیح اندازہ نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ آج مسلمانوں میں اس قدر

مذہبی تشدد باقی نہیں رہا جو آج سے ستر اسی برس اُدھر تھا (یہ وسعتِ قلب کی بنا پر ہے یا مذہب سے تعلق کم ہو جانے کی وجہ سے، یہ الگ سوال ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ آج مذہبی اختلافات میں بالعموم ایسا تشدد باقی نہیں رہا جیسا اس سے پہلے تھا)۔ اس زمانہ میں عوام کے میلانات و معتقدات کے خلاف لب کشائی کرنا، اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ اور پھر لب کشائی بھی ایسے نازک مسئلہ میں جس سے مخالفین عوام کے نازک ترین جذبات کو فوراً مشتعل کر دیں۔ یعنی انکارِ حجیتِ حدیث اور دعوتِ اکملیتِ قرآن۔ اس مسئلہ کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ آج (جبکہ، جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے) مذہبی تعصب بہت کم ہو چکا ہے، عوام اور سب کچھ برداشت کر لیں گے لیکن جس شخص کے ساتھ "منکرِ حدیث" کا لیبل چسپاں کر دیا جائے اسے کسی صورت میں بھی "مسلمان" ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ عوام کی یہی وہ دکھتی ہوئی رگ ہے جس سے ہماری مُلّائیت فائدہ اٹھاتی رہتی ہے۔ جب کبھی ان کے کسی مسلک کو قرآن کے خلاف ثابت کیجئے وہ اپنے مسلک کی تائید میں فوراً کوئی نہ کوئی روایت پیش کر دیں گے اور جونہی آپ نے یہ کہا کہ جو روایت قرآن کے خلاف جاتی ہو اسے کیسے صحیح مان لیا جائے وہ فوراً منکرِ حدیث کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی شخص اس کی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ ہماری سلطانی و مُلّائی و پیری کی ساری کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی حفاظت عوام کے انہی نازک جذبات کے اشتعال سے کی جاتی رہی ہے اور آج بھی کی جا رہی ہے۔ غور فرمایئے کہ آج سے ستر اسی برس ادھر اس آواز کو بلند کرنا کتنی بڑی جرأت، حوصلہ اور ہمت کا کام ہوگا۔ یہ وہی کر سکتا تھا جسے اللہ نے قرآن کا عشق عطا فرمایا ہو کیونکہ آگ میں کود جانا عشق ہی سے ہو سکتا ہے، عقل کی مصلحت کوشیوں سے نہیں۔ یہی وہ آواز جو آج سے ستر اسی برس ادھر شمس العلماء، حافظ، سید محب الحق صاحب نے بلند کی اور پھر تاحیات انہی کے اور جو ان کے سلسلہ میں دشواریاں پیش آئیں جاری رکھا۔ سید صاحب کی آواز پہلی مرتبہ بلند ہوئی ہوگی تو شاید حافظ صاحب قبلہ کو ایک مستقل ہمنوا ملا ہوگا۔ دعوتِ حق و صداقت میں ہمنوا کا نہ ملنا بھی بڑا صبر آزما اور جرأت طلب ہوا کرتا ہے۔ مقصد یہ کہ انسان تنہائی میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتا ہے بلکہ بعض اوقات بہ تقاضائے بشریت یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب کوئی بھی میری تائید نہیں کرتا تو شاید میں ہی غلطی پر ہوں۔ اس مقام سے صحیح و سلامت گزر جانا اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کو اپنے مسلک کی حقانیت پر یقینِ محکم ہو۔ لہٰذا اس تمام تگ و تاز میں ایمانِ محکم اور جرأتِ کاملہ ہی انسان کو ان دشوار گزار وادیوں سے پار لے جا سکتی ہے۔ سو کس قدر محکم تھا ایمان اس اللہ کے بندے کا اور کس قدر بلند تھا حوصلہ اس مردِ مومن کا جس نے اپنی ساری عمر اسی دعوت و پکار میں بسر کر دی کہ مسلمان پھر سے قرآن کی طرف آ جائیں اور اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے حاصل کر لیں۔

راقم الحروف کو قبلہ حافظ صاحب سے غائبانہ تعارف کا شرف ان کی گراں قدر تصانیف برہان الحق، دعوت الحق، منہاج الحق، شرعة الحق کی وساطت سے ہوا۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ طلوعِ اسلام کی وساطت سے میرے بعض مضامین آپ کی نظر سے گزرے اور آپ نے انھیں اس انداز سے سراہا کہ مجھ میں تحریراً شرفِ تخاطب و تکلم کی جرأت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۶۱ء میں میری کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی تو میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کی رسید جن الفاظ میں مجھ تک پہنچی وہ میرے لئے سرمایۂ ہزار فخر و سعادت ہیں۔ یہ خط اسی زمانہ میں طلوعِ اسلام میں شائع ہو گیا تھا۔ اس کے یہ فقرے مجھے کبھی نہیں بھولتے کہ

> جہاں تک کتاب کو دیکھا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عکسی قرآن چھپنا شروع ہوا ہے آپ نے میری عقیدت اور خیالات کا عکسی مرقع شائع فرمایا ہے۔ اس قدر اتحادِ خیالات بھی کیا حیرت انگیز نہیں ہے۔ اب ان کی تعریف کرنا اپنی تعریف کرنا ہے۔ اور فلا تزکوا انفسکم کے احاطے کے اندر ممنوع ہے۔ (۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء)

اس کے بعد کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ایک اور گرامی نامہ میں یوں نوازا۔

> میں نے معارف القرآن بالاستیعاب پڑھا۔ سبحان اللہ کیا کتاب لکھی گئی ہے۔ محض جزئیات میں کہیں کہیں اختلاف ہو بایں تو فطرتِ انسانی ہے جو ناقابلِ توجہ ہے۔ اس کتاب میں چند خصوصیتیں ہیں ایک تو یہ کہ سارے خیالات و اختلافات کو پیٹھ پیچھے پھینک کر خدا اور خدا کی صراطِ مستقیم نصب العین رہی ہے۔ میں کیا خدا اُسے قبول کرے مقبول کرے اور قوم کی نسبت اپنے ساتھ جوڑ دے جو اس کتاب کا نصب العین ہے۔ دوسرے اختلافات ونزاعات باہمی نے جو قرآن کے معنی بدل دیئے ہیں جو فطال علیہم الامد فقست قلوبھم کے اصول پر سارا قرآن محرف بنا دیا گیا ہے اس کی اصلاح ہو گئی ہے۔ تیسری ضرورت اور پوری ہونے کی امید ہے کہ قرآن کا صحیح ترجمہ جس کی ضرورت قوم کو شدید اور اشد ہے وہ انشاء اللہ پوری ہو جائے گی مگر افسوس یہ ضرور ہے کہ یہ ضرورت کئی جلدوں میں پوری ہوگی اس لئے اگر آپ کو ساری جلدوں کی تصنیف سے فرصت ہو گئی ہو تو اس کا موقع ہے کہ ساری کتاب جو ابھی غیر مطبوعہ ہے اس سے قرآنی الفاظ کے معانی کی صحت کر کے قرآن کا ترجمہ شائع کیا جائے جو سارے ترجموں پہ حکم ہو اور جس کی تبلیغ آسان اور عام ہو سکے اور اس انقلابی دور میں جس کے مقبول اور مصلح ہونے کی فضا خدا نے پیدا کر دی ہے۔
>
> خدا سے دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں۔ میں بھی اب تک یوں توں زندہ ہوں۔

قوم نہ بدلے گی اس کا حال نہ بدلے گا جب تک اس میں روحانیت اور پاک باطنی نہ آئے گی اور یہ بغیر خدا کی خالص محبت کے حاصل نہیں ہونے کی۔ ضرورت ادھر توجہ کرنے کی بھی ہے اس کی صورت یہی ہے کہ قوم کو قرآن کی تلاوت معانی و مفہوم کے ساتھ کرنے کی تبلیغ کی جائے زبانی بھی، عملی بھی۔ اسٹیج سے نہیں بلکہ مسجدوں میں بیٹھ کر چند لوگوں میں بطور مشورت پیش کرنے کا رنگ اختیار کیا جائے افسوس کہ اس کے لائق میں اب نہیں رہا۔

اس کے بعد یہ تعلق ایسا قائم ہوا کہ میں نے اس حقیقت کو اپنے سامنے محسوس پیکر میں دیکھ لیا کہ جو قلبی تعلق قرآن کے رشتہ سے استوار ہوتا ہے اس سے زیادہ گہرا اور محکم تعلق اور کسی صورت میں ممکن نہیں۔

لیکن یہ تعلق غائبانہ ہی رہا تا آنکہ تقسیم ہند کے بعد میں ہندوستان (دہلی) سے پاکستان (کراچی) آگیا۔ مجھے یہاں پہنچ کر سب سے بڑا قلق، علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کی فیوضِ صحبت سے محرومی اور قبلہ حافظ صاحب سے شرفِ نیاز کے حصول کے امکانات کی کمی کی وجہ سے تھا۔ میری طلب صادق تھی۔ اللہ نے میری دعاؤں کو مستجاب فرمایا۔ علامہ اسلم صاحب خود میرے ہاں تشریف لے آئے اور قریب آٹھ نو ماہ تک یہیں فروکش رہے۔ قبلہ حافظ صاحب بھی اپنے اعزہ کے ہمراہ ہمارے کراچی تشریف لے آئے۔ مجھے اس خبر سے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ قریب دس سال کی غائبانہ ملاقات نے بالمشافہ نیاز کی صورت اختیار کی۔ للہ الحمد کہ اس مردِ مومن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ قریب سو سال کا سن، لانبا قد، اس کبر سنی میں بھی چہرے کا جلال ایک پاکباز زندگی کا آئینہ دار۔ ایک آنکھ پہلے جاتی رہی تھی، دوسری سے بھی بینائی کم ہو رہی ہے۔ لیکن چشمہ کی مدد سے اب بھی پڑھ سکتے ہیں اگرچہ بہ تکلف۔ ثقلِ سماعت ہے۔ پیری کا ضعف اور اس سے پیدا شدہ مختلف عوارض۔ لیکن اس کے باوجود نماز کی پابندی کا وہی التزام جو شروع سے چلا آتا تھا قائم ہے۔ بڑی محبت سے ملے۔ فرمایا کہ تم کو ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے میری یہ آرزو پوری کر دی۔ پھر، میری حوصلہ افزائی کے لئے کہا کہ میں نے جب دعوت الی القرآن کی ابتدا کی ہے تو ہمیشہ یہ خیال میرے دامنگیر رہا کرتا تھا کہ معلوم یہ آواز یہیں ختم ہو جائے گی یا اس دیئے سے آگے دیا بھی جلے گا۔ اللہ نے میری آواز سن لی۔ میری زندگی ہی میں یہ دعوت عام بھی ہوئی اور تم سے تعارف کے بعد اس کی بھی تسلی ہو گئی کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب میں اطمینان کی موت مروں گا۔

اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں مجھے کوئی دن ایسا یاد نہیں پڑتا کہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں اور مزاج پرسی کے بعد، قرآن کے علاوہ کسی اور موضوع پر سلسلۂ گفتگو چھڑا ہو۔ پچھلے مہینے

اُن پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا۔ ایک تو کبر سنی کی نقاہت، اس پر مرض کا سخت حملہ۔ کمزوری یہاں تک بڑھ گئی کہ قریب دو روز غش کی سی حالت رہی۔ میں عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ حبیب مکرم ڈاکٹر حمید صاحب کہ جن کے مقدر میں ایسی بابرکت ہستیوں کی خدمتِ معالجہ کی سعادت لکھی ہے، میرے ساتھ تھے۔ حافظ صاحب قبلہ بہت کمزور ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے دو تین منٹ تک مرض اور اس کے تقضیات سے متعلق باتیں ہوئیں۔ محسوس ہو رہا تھا کہ انھیں بات کرنے میں خاصی تکلیف ہو رہی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ گفتگو کو خود ہی ختم کر دیا کہ مبادا نقاہت بڑھ جائے۔ اس کے بعد آپ نے مجھے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا کہ اس غنودگی کے سے عالم میں قرآن کی ایک آیت میرے ذہن میں چکر لگا رہی تھی۔ جی میں تھا کہ تم آؤ تو اس کے متعلق کچھ بات کر سکوں۔ اس کے بعد جو سلسلۂ کلام شروع ہوا ہے تو قریب آدھے گھنٹے تک اس انداز سے جاری رہا گویا آپ بالکل تندرست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رہ رہ کر مشوش ہو رہے تھے کہ اس تکان سے مرض بڑھ جائے گا۔ اُن سے ایک آدھ مرتبہ عرض بھی کیا گیا تو فرمایا کہ اس گفتگو سے مجھے تقویت ملتی ہے۔ آپ کچھ فکر نہ کریں، اس کی وجہ سے میرے مرض میں کمی ہوگی، زیادتی نہیں ہوگی۔

اللہ اکبر! کیسی قابلِ رشک ہے یہ زندگی اور کس قدر بے پایاں عشق ہے خدا اور اس کے کلام سے۔ اور کیسا بابرکت ہے یہ گھر جس میں ہر وقت قرآن کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ وہاں جائیے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ساری فضا قرآنی تذکار سے معمور ہے۔ حتیٰ کہ ان کے ایک صاحبزادہ مصطفیٰ میاں کی بیوی ایک یورپین خاتون ہیں۔ ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ میاں، بیوی اور ان کا بچہ، ہر شام، بلاناغہ، قرآنی درس و تدریس اور بحث و تمحیص میں منہمک ملیں گے۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب۔

مولویوں کے طبقہ میں عام طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ غلطی محسوس ہو جانے کے بعد اپنی ضد (ریخیا بینھم) پر اڑے رہتے ہیں اور دور از کار مباحث اور تاویلات سے کوشش کرتے ہیں کہ اپنی بات کو سچا ثابت کر دکھائیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو سینے قرآن کی دولت سے معمور ہوں، ان میں ہٹ، ضد اور بات کی پیچ کے بجائے، سینے کی کشادگی اور نگاہ کی بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات میں نے علامہ اسلم مدظلہ میں بھی دیکھی اور قبلہ حافظ صاحب کے ہاں بھی۔ مثلاً ایک دن میں حاضر ہوا تو آپ ایک مسئلہ کی تشریح فرما رہے تھے۔ بڑے مسکت دلائل اور واضح اسلوب کے ساتھ۔ اخیر میں میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کتنے دنوں سے میں اس باب میں غور کر رہا تھا۔ اب اس کا حل ملا۔ انھیں اس حل سے پورا اطمینان تھا۔ بات ختم ہونے پر میں نے عرض کیا کہ قرآن میں فلاں آیت ہے جو آپ کے بیان فرمودہ حل سے مختلف ہے، اس کی بابت کیا ارشاد ہے!

ایک ثانیہ کے تامل کے بغیر فرمایا کہ اللہ مجھ پر رحم کرے۔ اب حافظہ کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ

یہ آیت قطعاً مجھے یاد نہیں آئی۔ میں نے کہا کہ اس سے پہلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرمایا کہ اب کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جب اللہ کا فیصلہ سامنے آگیا تو پھر مزید بحث کی گنجائش کہاں ہے۔ میری غلطی تھی۔

یہ ہے وہ وسعتِ قلب جو قرآنی بصیرت اور تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ میں بلا تکلف عرض کروں گا کہ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ قرآن، انسان کے قلب و دماغ میں کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور ایسی ہستیوں کے پاس بیٹھنے سے بھی کیا کچھ حاصل ہو جاتا ہے، تو قبلہ حافظ صاحب کو دیکھئے اور علامہ اسلم جیراجپوری کو۔ میری نگاہ نے ان سے بہتر قرآن جاننے والا، اور جاننے کے بعد اس کے رنگ میں رنگے جانے والا اور کوئی نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے تو بہ پیر سے مستفیض ہونے کا تا دیر موقعہ عطا فرمائے۔

اتوار (۱۹ جون) کی صبح کسی نے میرے دروازہ پر دستک دی۔ دیکھا تو حافظ صاحب قبلہ کے منشی صاحب ہیں۔ کہا کہ حافظ صاحب تشریف لائے ہیں۔ دیکھا تو مصطفیٰ میاں کے ساتھ موٹر میں تشریف فرما ہیں۔ ضعفِ پیری اور عوارض کی وجہ سے آپ کے لئے پاؤں چلنا تو ایک طرف، موٹر تک کا سفر دشوار ہو چکا ہے۔ حیران کہ انھوں نے اس قدر تکلیف فرمائی۔ فرطِ انبساط سے میرا یہ عالم کہ ——— جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں ——— کرم فرمایا اور موٹر سے اتر کر کمرے تک تشریف لے آئے۔ میرا ظلمتکدہ، قرآن کے نور سے وادیٔ ایمن بن گیا۔ تشکراً عرض کیا کہ آپ نے اس قدر زحمت فرمائی۔ فرمایا کہ کئی دنوں سے یہ کھٹک پیدا ہو رہی تھی کہ ایک خادمِ قرآن کے پاس چل کر جانے کے ثواب سے کہیں محروم ہی نہ رہ جاؤں۔ آج یہ آرزو پوری ہو گئی۔

وہ یہ کچھ فرما رہے تھے اور میری یہ کیفیت تھی کہ ——— چشم بروئے او کشا باز بجولیشتن نگر ———

حیران تھا کہ اس کا کیا جواب دوں۔ ان کی لطف فرمائی کی بنا پر فرطِ انبساط اور ہیچ میرزی کے احساس سے دفورِ ندامت کے ملے جلے جذبات سے میرا سینہ طلسمِ پیچ و تاب بن گیا اور باوجود ہزار کوشش کے میں ایک لفظ تک بھی نہ کہہ سکا۔

اس مقام پر مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ قریب سات آٹھ سال اُدھر کا ذکر ہے۔ میں گرمیوں کی ایک شام اپنے مکان، واقعہ نور جہاں روڈ (نئی دہلی)، پہ بیٹھا تھا کہ سامنے ایک بڑا شاندار موٹر رکا اور اس میں سے ایک باوقار شخصیت نے میرے مکان کا رخ کیا۔ قریب آکر کہا کہ میں ہوں سید عبد العزیز*

*عزیز الملت، سید عبد العزیز (مرحوم) سابق صدر بہار مسلم لیگ، جو اس زمانہ میں مملکتِ حیدر آباد میں وزیر امور مذہبیہ تھے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ نے اتنی زحمت فرمائی۔ مجھے اطلاع دی ہوتی تو میں خود حاضر ہوتا! (سید صاحب کے

خلوص اور ان کی بے لوث خدمات کا میں بیحد معترف تھا۔ فرمایا کہ میں قرآن کی نسبت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہیں وہاں بلانے کی جسارت کیسے کرتا! میں نے جاتے وقت معارف القرآن (جس کی جلد اول اس زمانہ میں ابھی ابھی شائع ہوئی تھی) کا ایک نسخہ پیش کیا تو اسے احتراماً کھڑے ہو کر لیا اور جھک کر تعظیم کی۔ قرآن سے ایسی محبت!

کیوں نہ ہوتی؟ وہ بھی تو اسی معدنِ رشد و سعادت کے درشاہوار تھے۔ قبلہ حافظ صاحب سے انہیں برادر نسبتی ہونے کا تعلق تھا۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

قبلہ حافظ صاحب سے سلسلہ کلام چھیڑا تو فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ میں نواب اللہ میاں کے ہاں سے [illegible] (توسیع ملازمت) پر ہوں۔ پہلے درخواست کی تھی کہ تمہاری کتاب کی دوسری اور تیسری جلد دیکھ لینے تک کی مہلت مل جائے۔ وہ منظور ہو گئی تو اب جلد چہارم تک کی توسیع کے لئے پھر گذارش کیا ہے۔ لہٰذا اس کی تکمیل طباعت میں جلدی کرو۔ فرمایا کہ میری بینائی کا تھوڑا سا حصہ جو باقی رہ گیا ہے اسے میں نے اس کتاب کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔

کس قدر بلند ہے نگاہ ان حضرات کی جو اس انداز سے دوسروں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ دعوت الحق میں ایک مقام ایسا ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ کل ہی کچھ لکھا ہے اور اس طرح لکھا ہے کہ کاغذ پر قلم چلائے گیا ہوں۔ اس لئے کہ دکھائی تو دیتا نہیں کہ کیا لکھ رہا ہوں۔ مکمل ہو گیا تو تمہارے پاس بھیجدوں گا۔ قرآن کے متعلق کوئی ایسی بات دوسروں تک نہیں پہنچانی چاہیے جس کی صحت میں یقین نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے یقین کے باوجود تم غلطی پر ہو۔ لیکن اس سے اللہ کے ہاں سے معافی کی امید ہو سکتی ہے۔ پہلی صورت میں نہیں۔

چونکہ دن ڈھل رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی تمازتِ آفتاب بھی اس لئے کچھ دیر کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

یہ تھی وہ نورانی صبح جو میری زندگی کے یادگار لمحات میں رہے گی۔ ان ہستیوں کا وجود مغتنمات میں سے ہے۔ ان کے بعد یہ کرسیاں خالی ہو جائیں گی اور ہماری نگاہیں اس روشنی کے لئے ترستی رہیں گی۔

تقویٰ اور تدین کی بے لوث زندگی اور تمام عمر قرآن میں تدبر اور اس کی تبلیغ! یہ ان کے بعد کہاں ملے گا!

مبارک ہیں یہ ہستیاں اور مبارک ہیں ان کے ثمراتِ حیات۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ذلک ھو الفوز العظیم۔

ترکی اور مجلسِ یورپ

شریکِ مجلسِ یورپ نہ ہو سکے ترکی! — کیا ہے فیصلہ اہلِ فرنگ نے یہ عجیب

مریض تھا تو ہمیشہ "مریضِ یورپ" تھا — ہے تندرست تو پہلو بچا رہے ہیں طبیب

گذشتہ جنگ میں ثابت ہوا مہذب کون؟ — قیامِ امن ہی ٹھیرے جو حاصلِ تہذیب

ملی وہ نعمتِ امن و سلام ترکوں کو — فرنگ میں جو کسی اور کو ہوئی نہ نصیب

یہ واقعہ ہے کہ ترکوں کی دوستی کے لئے — بہت سے ملک ہیں آج ایک دوسرے کے رقیب

یقین ہی نہیں آتا اُنھیں محبت کا — ہے اہلِ غرب میں ترکوں کا نام اب بھی مہیب

نہیں ہے اس کے سوا اور کچھ خطا اُن کی — کہ وہ فرنگ میں اسلام کے رہے ہیں نقیب

اسدؔ! گلہ یہ نہیں ترک بھائیوں سے بھی ہے — نہیں رہا اُنھیں اندازۂ ہلال و صلیب

یہ آرزو ہے کہ اُن کو میاں بشیر احمد — سنائیں حضرتِ اقبالؒ کا یہ شعرِ غریب

"سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب"

اسدؔ ملتانی

دورِ حاضر کی بہترین کتابیں

رقصِ ابلیس	ایم اسلم	۴/-/-	وحشت	″	۳/-/-
شفق	″	۳/-/-	باغی	″	۳/۸/-
انقلابِ اسلام	″	۳/۸/-	دل	″	۴/-/-
مرد غازی	″	۲/۸/-	طوفان	″	۳/۴/-
آخری رات	″	۴/-/-	عورت	″	۲/۸/-
شام و سحر	″	۵/-/-	داستانِ مجاہد	نسیم حجازی	۴/-/-
شامِ غریباں	″	۳/۴/-	محمد بن قاسم	″	۵/-/-
نسیم	رشید اختر ندوی	۳/۸/-	آخری چٹان	″	۴/-/-
تلخیاں	″	۳/۸/-	سو سال بعد	″	۲/-/-
نشانِ راہ	″	۳/۸/-	انسان اور دیوتا	″	۵/-/-
کانٹوں کی سیج	″	۳/۸/-	شاہین	″	۴/۸/-
باد و باراں	″	۳/-/-	کلیاں	عصمت چغتائی	
تشنگی	″	۳/۸/-	ایک بات	″	
نشیمن	″	۳/۸/-	زندگی	(چودھری افضل حق)	۴/-/-
نسرین	″	۴/-/-	شاہ اسماعیل شہید	(عبید اللہ بیگ)	۳/-/-
ایک پہیلی	″	۳/-/-	سیرتِ اقبال	(محمد طاہر)	۵/-/-
پندرہ اگست	″	۳/-/-	سرودِ کائنات	منصور احمد مرحوم	۲/-/-
گل رخ	″	۲/-/-	کشمیر		
عشرت	عارف بٹالوی	۲/۸/-	حیاتِ محسن حسرت		۲/۸/-
امیر پاکستان	″	۲/-/-	جواہرات	افضل حق	۳/۸/-
دیدہ و شنیدہ	رئیس احمد جعفری	۳/۸/-	اسلامی نظامِ تعلیم	درانی	۴/-/-

ملنے کا پتہ: عارف پبلشنگ ہاؤس۔ رابسن روڈ۔ کراچی

اسلامی مطبوعات

دینِ اسلام	۲/-/-
محبوبِ خدا	۲/۸/-
نسیمِ حجاز	۱/-/-
ارمغانِ یثرب	۱/-/-
الفاروق	۴/-/-
تاریخِ اقوامِ عالم حصہ اول	۴/-/-
" " " دوم	۵/-/-
اسلام کے معارف	۲/-/-
دینِ کامل	۱/۸/-
قدسی	۱/-/-
افضل الاخلاق	۳/-/-
جامع الاخلاق	۳/-/-
طلوعِ اسلام چار حصوں میں	
فی حصہ	۳/-/-
غزواتِ نبوی	۱/-/-
سیرتِ رسولِ عربی	۴/-/-
آفتابِ رسالت	۱/-/-

جنابِ پرویز کی لازوال تصنیف

معارف القرآن کے مکمل سیٹ بہت کم تعداد میں رہ گئے ہیں اور جلد چہارم شائع ہو جانے کے بعد باقی ماندہ سیٹ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائیں گے۔ اس لئے اگر آپ کے پاس سیٹ نہیں یا نامکمل ہے تو مطلوبہ جلدیں بہت جلد خرید لیجئے۔ ورنہ ایسی گراں قدر کتاب پھر کسی داموں بھی نہیں ملے گی۔ اس خیال سے کہ آپ کو مقامی تاجروں کے مقابلہ میں ہم سے خریدنے میں محصول ڈاک زائد دینا پڑتا ہے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ مکمل سیٹ پر محصول ڈاک ہم خود ادا کر دیں گے۔ یہ رعایت ناشرین کی طرف سے نہیں ہماری طرف سے ہے۔ قیمت مکمل سیٹ ۳۲/-/-

اسلامی معاشرت

اسلامی باتیں

یہ کتاب چھوٹے بچوں کے لئے نہایت مفید ہے -/۱۲/-

ان کے علاوہ ہر قیمت کے عکسی رنگین تاج کمپنی لمیٹڈ کے قرآن مجید بارعایت ہم سے طلب فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

عارف پبلشنگ ہاؤس۔ رابسن روڈ۔ کراچی

آفاق

● آفاق ایک علمی، ادبی اور سیاسی رسالہ ہے۔ جو ملک کے مشہور اہل قلم حضرات کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے

● آفاق کے پیش نظر ایک معین نصب العین اور پاکستان کی تعمیر اور اس کے استحکام کے سلسلے میں کچھ بنیادی اصول ہیں جن کی وہ دعوت دیتا ہے

● آفاق آئینہ ہوگا۔ پاکستان کے ادبی رجحانات اور علمی و سیاسی افکار کا، نیز وہ روزمرہ کے واقعات پر نہایت غیر جانبداری سے تنقید کرتا ہے۔

● آفاق معمار قوم اور اس کے محتسب دونوں کے فرائض سر انجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔

● آفاق میں ملک کے چوٹی کے ادیب، عالم اور سیاسی اہل قلم مستقل طور پہ مضامین لکھا کرتے ہیں۔

● آفاق کا سالانہ چندہ دس روپے اور ایک پرچے کی قیمت چار آنے ہے۔

خریداری اور ایجنسی کیلئے اس پتے پر لکھئے

منیجر ہفت روزہ "آفاق"۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور

محتاط اور صالح ادب کا واحد ترجمان

ماہنامہ نشیمن کراچی

ترتیب دینے والے

مسز رفاطمہ خانم - بی اے - بی ٹی — اختر انصاری اکبرآبادی

نشیمن میں معیاری افسانے، سیر حاصل تنقیدی مضامین، نامور شعراء کی غزلیں اور نظمیں شائع کی جاتی ہیں۔ چند خصوصی لکھنے والے یہ ہیں۔

سراج لکھنوی۔ ماہر القادری۔ عارف جلالوی۔ غلام محمد بٹ۔ ثاقب کانپوری۔ جہاں بانو نقوی ایم اے ایم اسلم۔ حسان الحق حقی۔ لیلیٰ لکھنوی۔ عارفہ بیگم۔ انجم صدیقی۔ سیدہ اختر حیدرآبادی۔ فاروق محشر بدایونی۔ صہبا اختر رعلیگ، مسرور مشکور۔ انجم کاظمی۔ سیدہ ساحر میرٹھی۔ راغب لکھنوی اور دوسرے۔ چندہ سالانہ - پانچ روپے قیمت فی کاپی۔ آٹھ آنے۔ نمونہ کی کاپی آٹھ آنے کے ٹکٹ آنے پر بھیجی جائے گی۔

مینیجر نشیمن یوسف اسٹریٹ۔ بندر روڈ۔ کراچی

اپنے محبوب وطن کی آزادی کی تقریب پر

نہایت آب و تاب کے ساتھ ماہ اگست ۴۷ء میں کاغذ، ضخامت، نفیس، بہترین شعراء، ادباء کی تصاویر، گوناگوں رشحاتِ قلم سے مزین

ماہنامہ طلوعِ سحر راولپنڈی

آزادی نمبر

پیش کر رہا ہے

قیمت :- ایک روپیہ — ضخامت تقریباً ڈیڑھ سو صفحات

پاکستان کے تمام ریلوے بک اسٹالوں اور اپنے شہر کے ایجنٹ سے طلب کریں

ایجنٹ و مشتہرین حضرات ابھی سے آرڈر بک کرالیں

مینیجر طلوعِ سحر ۹۰ بی۔ راولپنڈی

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی

اسلام میں عجمی افکار و علوم کے اثرات و نتائج پر تنقید۔

یعنی اسلام کے نصب العین حکومتِ الٰہیہ کی تشریح

اسلام میں ملوکیت، قیصریت، پاپائیت و مشیخت کا نفوذ۔ ان کے آغاز ارتقاء و انحطاط کی مفصل تاریخ۔

اسلام میں بیرونی علوم و افکار کا شیوع اور قرآن و حدیث و فقہ و فلسفہ و کلام اور تصوف پر ان کے اثرات و نتائج۔

بحث و تنقید باہمی نزاعات پر جائزے سیاسیات و عقائد، نقد و فلسفہ کے اسباب و نتائج۔ تجدید احیائے دین کی مساعی اور زوال۔ ملتِ اسلامیہ کی مکمل تاریخ عصرِ حاضر سے اسلام کا تصادم اور مستقبل کی تجویز

از عبدالوحید خاں بی اے ایل ایل بی

قیمت فی جلد آٹھ روپے

ملنے کا پتہ
لاہور — تمام تاجران کتب سے
کراچی — ملت پبلشنگ ہاؤس۔ ولیسن روڈ۔ کراچی

فردوسِ گم گشتہ

جناب پرویز کے

ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے ہزاروں نوجوانوں کے دلوں سے شکوک و شبہات کے کانٹے نکال کر انہیں وہ اطمینان عطا کر دیا جو صرف یقین اور بصیرت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ آنے والا مورخ جب ہمارے زمانہ کی تاریخ لکھے گا تو وہ اس انقلاب کا صحیح اندازہ لگا سکے گا جو جناب پرویز کے حقیقت نگار قلم نے دلوں کی بستیوں میں پیدا کر دیا ہے۔ یہ تمام مضامین ایک خوشنما مجموعہ کی شکل میں اشاعت کے لئے پریس میں جا چکے ہیں۔ کتاب قریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ کتاب کی مانگ اس قدر زیادہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ دیر میں طلب کرنے پر مل نہ سکے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ ایک اطلاعی کارڈ لکھ کر اپنے لئے ایک جلد مخصوص کرا لیں۔

قیمت کی اطلاع کتاب تیار ہونے پر دی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

ولیسن روڈ — کراچی

ماہنامہ

فردوس کراچی

انجمن ترقی اردو کے آرگن "قومی زبان" کراچی نے ماہنامہ فردوس کا خیر مقدم ان الفاظ میں کیا ہے

ملا واحدی صاحب۔ دلی کے مشاق و تجربہ کار صحافی ہیں۔ دلی کے ہنگامہ کے سبب انہیں بھی ترک وطن کرنا پڑا۔ اب کراچی میں "فردوس" کی نخل بندی کی ہے۔ مضامین میں تنوع اور دلکشی اور ہلکا مذہبی و اصلاحی رنگ پایا جاتا ہے۔

رسالہ طلوع اسلام کراچی لکھتا ہے۔

ہمارے ملی زوال سے جہاں اور شعبوں میں بے راہ روی پیدا ہوئی وہاں شعر و ادب بھی بے زمام ہو گیا اور لطف یہ کہ اس ادبی اوباشن پن کا نام ادب لطیف رکھ لیا گیا اور سمجھ لیا گیا کہ محض اس نام سے اس کی تمام کثافتیں لطافتوں میں بدل گئی ہیں۔ کچھ ارباب ذوق ایسے بھی تھے جو اس ہمہ گیر بے راہ روی کی زد میں نہ آئے اور متانت و سنجیدگی کے مسلک پر گامزن رہے۔ دلی (مرحوم) کے واحدی صاحب کا شمار ان میں ہے۔ دلی اجڑی تو ان کی محفل ادب بھی برہم ہو گئی۔ اب آپ کراچی سے "جگر لخت لخت" کو جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاکہ پھر سے ارباب نظر کی "دعوت مژگاں" کا سامان بہم پہنچایا جا سکے۔ ان کی اس کوشش کا ماحصل "فردوس" ہے۔

رسالہ معارف اعظم گڑھ لکھتا ہے۔

دہلی کے مشہور صاحب قلم جناب واحدی صاحب نے "فردوس" کراچی سے نکالا ہے۔ فردوس اچھے ادبی رسالوں کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ مضامین میں تنوع معلومات میں افادہ اور ذہنی لطف و تفریح ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا کوئی مضمون بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ سندھ میں صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے کیلئے ایسے مضامین کی بڑی ضرورت ہے ہم کو امید ہے کہ اردوئے معلی کا یہ پودا سندھ کے ریگستان میں نہ صرف بارآور ہوگا، بلکہ اس کو زبان و ادب کا لہلہاتا ہوا چمن بنا دے۔

المشتہر منیجر فردوس پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱ - کراچی